دریچہ

(افسانے)

ساحل احمد

دریچہ
ساحل احمد

بانٹ دے اپنی خوشی ساحلؔ یہاں
رکھ نہ پایا آج تک دنیا کوئی

——ساحل احمد

دریچہ

کتاب کا نام : دریچہ (افسانے)

افسانہ نگار : ساحل احمد

صفحات : ۱۲۸

قیمت : ۱۰۰ روپے

طبع اول : جولائی ۲۰۱۱ء

پروڈکشن : اردو بک ریویو، نئی دھلی-۲

DAREECHA (Stories)

By

SAHIL AHMAD

Price: Rs. 100/- Ist Edition: July 2011 Pages: 128

ناشر

اردو رائٹرس گلڈ، الٰہ آباد۔

به اهتمام

محمد عارف اقبال

APPLIED BOOKS

PUBLISHERS & DISTRIBUTORS

1739/10 (Basement), New Kohinoor Hotel, Pataudi House,
Darya Ganj, New Delhi - 2 Tel.: 011-23266347 / 09953630788
Email: appliedbooks@gmail.com

Coposed at: Urdu Book Review, New Delhi - 110002 Tel. 011-23266347

Printed at: Classic Art Printers, New Delhi - 110002

انتساب

برادرِ عزیز رزّاق افسر (میسور)
کے نام

حیات اپنی تو ہر پل سفر مدام سفر
تھکن کا نام نہ لے اور مسافتوں میں اتر
——— رزّاق افسر

ترتیب

پیش لفظ	۹	جنگل کا راجا	۷۱
ایک لمحہ	۱۱	دائرے کی موت	۷۳
تنکا	۱۴	فریم	۷۶
تحفہ	۱۹	دولت پور کا آخری نواب	۷۸
قصہ آدھے فرلانگ کا	۲۶	دردِ دل	۸۳
شامِ غم کے بعد	۳۱	لکیر، نقطے اور دائرے	۸۹
زخم دل	۳۸	ایک دن کی بات	۹۱
خوبصورت موڑ	۴۱	گلاب کی خوش بو	۹۴
پ	۴۷	نہیں بھول سکتا	۱۰۳
دریچہ	۵۰	فتو آپا	۱۰۷
انگلی کا درد	۵۴	صرف پندرہ منٹ	۱۱۳
اٹھارہ نمبر	۵۷	کھنڈر	۱۱۶
رسّی، سانپ اور مینڈھک	۶۱	لمحات یقین کے	۱۲۱
حیرتی ہے آئینہ	۶۴	گلابی تتلی	۱۲۳
مزارِ خشت	۶۸	یہ کیا؟	۱۲۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

۱۹۵۰ء سے قلمی رشتہ قائم رکھتے ہوئے ابتداً بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ اپنے تعلیمی اخراجات اور نجی ضروریات کے لیے افسانوی دوستی بہت مفید ثابت ہوئی۔ ۱۹۵۵-۵۶ء میں جاسوسی اور رومانی تحریریں نوجوانوں کے لیے حصول راحت کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اصلاح زبان کے لیے بھی معاون ثابت ہوئیں۔ میں نے بھی ناشروں کی فرمائش پر ۱۰۰ تا ۱۲۰ صفحات تک کے تقریباً ساٹھ ناول ضرور لکھے ہوں گے۔ آج میری تحویل میں دو چار ادھورے ناول پڑے ہوئے ہیں۔ جنھیں مکمل کیا جا سکتا ہے اور ہاں اسی درمیان کچھ خفی تحریریں بھی دو یا تین فارموں پر مشتمل رقم کی ہیں۔ چند ایک آج بھی پردہ کرتی موجود ہیں۔

عموماً میرے افسانے بیسویں صدی، زر افشاں، روبی، بنت حوا، معمار، آہنگ، مورچہ، بلٹز، امیج، پاسبان، تحریک، حیات، خیابان، روشنی، ترنم، برگِ آوارہ میں شائع ہوئے۔ میان ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۶ء یہ وہ افسانے ہیں جو اپنے وقت میں بہت مشہور ہی نہیں مقبول بھی ہوئے۔ جو میں محفوظ رکھ سکا اُن میں سے ۲۳ افسانے "چہرہ" میں بھی شامل ہیں۔ "چہرہ" ۱۹۸۸ء میں چھپی اور اب "دریچہ" میں ۲۹ افسانے شامل ہیں اور نہ جانے کتنی بڑی تعداد اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے فروخت کر دیے۔ یہ صورت حال ۱۹۶۳ء تک رہی اور جب ۱۹۶۴ء میں مدرّسی کا حق ملا، اپنی تحریروں کا پاس و لحاظ رکھا اور آج بھی دس دن میں ڈیڑھ سو صفحہ کا

ناول لکھ سکتا ہوں۔ بچپن سے داستانوں سے ہی نہیں جاسوسی، رومانی اور تاریخی ناولوں کے قریب رہ کر فیض یابی کا شرف حاصل کیا۔ تحریر کی جلی وخفی حسی رشتوں سے قلمی رفاقت قائم کی۔ ایک ہزار سے زاید نثری اصالت اسی رفاقت کی زایدہ ہے۔ افسانے الگ، ناول الگ، ڈرامے الگ، فیچر الگ۔ ان کی تعداد بھی کئی سو سے زیادہ ہے اور شعر بھی دس ہزار سے کم نہیں کہے ہوں گے اور یہ اسّی کتابیں میرے قلمی طہارت کو آئینہ کرتی ہیں۔ اللہ باقی ماندہ تحریریں جلد شائع کرادے۔ کرم اس کا رحم اس کا۔ اس دنیا میں کیا ملا مجھ کو، محبت کم نفرت وغیریت زیادہ ملی۔ نہ ہوا اپنا کوئی، میں تو ہوں صدق وراستی کے ساتھ۔

میرے کئی سال رقص وموسیقی اور ڈرامہ اسٹیج کی وجہ سے ضائع ہوئے۔ والد صاحب کی سرزنش کا شکار رہا۔ سب کچھ اپنی غلطی قبول کرتے ہوئے خود کفیل بننے کی سعی کی۔ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۴ء تک یہی کیفیت رہی، ۱۹۶۰ء میں باضابطہ کالج سے تعلیمی رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ مجاز بھائی کی یاد میں ۱۹۶۱ء میں ''آہنگ'' جاری کیا۔ میرا بچپن اور ان کا دستِ شفقت آج بھی یاد ہے۔

ان تمام علمی وادبی رشتے کے باوجود نہ صرف الہ آباد میں بلکہ یہاں دہلی میں بھی غیریت ہی ملی۔ میرے کاموں پر پردہ ڈالنے کے لیے مجھے ادبی وعلمی جلسوں اور مذاکروں سے دور رکھا گیا۔ ابھی ایک مسلوبی نے الہ آباد کی ادبی وتخلیقی فضا کے تعلق سے مضمون لکھا، میں اس میں کہیں موجود نہیں۔ اسی طرح ایک اور مسلوبی نے اپنی تاریخ اردو ادب کی کسی بھی جلد میں میرا نام لینا پسند نہیں کیا۔

ہاں اس کے بعد چالیس پچاس سال پرانے ڈراموں اور فیچر کے تعلق سے مجموعہ پیش کرنے کی سعی کروں گا۔ اس افسانوی سفر کے تعلق سے آپ کے تاثرات کا بھی منتظر رہوں گا۔ شکریہ!

از دہلی
۱۰/جون ۲۰۱۱ء

ساحل احمد

ایک لمحہ

تمہارے لیے یہ کوئی ایسا وقت نہ تھا کہ سوچ بچار کرتے بلکہ اپنے اس ارادے کو عملی شکل بھی دے دینی چاہیے تھی کیونکہ ایسی خاموشیاں ہزار قسم کی پیچیدگیاں پیدا کر دیتی ہیں اور ایسی گتھیاں پڑ سکتی ہیں جس کا سلجھانا آسان نہیں اور اگر سلجھانے کی سعی بھی کی تو سدا کے لیے ٹوٹے ناخونوں پر کڑھتے رہو گے اور جب جب دیکھو گے ایک کسک، ایک بے چینی تمہارے جسم میں سرسراتی معلوم ہو گی۔

تمہارے سامنے ایک ایسا پورٹریٹ ہے جس کے خوبصورت خطوط اور نقطے تمہیں مسحور کر دیں گے اور تم اس کی بناوٹ، اس کی سجاوٹ، اس کی لکیروں اور اس کے نقطے پر غور ہی کرتے رہ جاؤ گے اور پورٹریٹ تم پر ایک بوجھ جائے گا۔ جسے تم اُٹھا نہ پاؤ گے اور تمہارے شانے لہولہان ہو جائیں گے۔ اعضا فضا میں بکھر جائیں گے اور تم محض ایک سیاہ نقطہ کی طرح ثبت ہو کر رہ جاؤ گے۔ اور پھر ایک ایسا وقت آئے گا کہ تم اس دھرتی کی کوکھ میں سو جاؤ گے۔

یہ بھی کوئی بات ہے جو تم اس خوبصورت پورٹریٹ کو یونہی کھلا رہنے دینا چاہتے ہو۔ تم اپنی سادہ لوحی اور مصوری کے ناز کمال میں ایسا محو ہو گئے ہو کہ اپنے اردگرد کے ماحول سے یکسر بے گانہ اور لا پرواہ ہو کر اس کی باریکیوں، نقطہ آفرینیوں اور تراش خراش میں لطف حاصل کر رہے ہو۔ لیکن تم کو یہ پتہ نہیں کہ وہ

پورٹریٹ دھیرے دھیرے تمہاری سمت بڑھنے لگا ہے اور تم کو اپنی گرفت میں لے لینا چاہتا ہے۔ لیکن تم اس کی طرف سے بالکل بے خبر جانے کیا سوچ رہے ہو۔ تمہاری اس وارفتگی میں ذرا بھی عقل و دانش کا عنصر شامل نہیں اور وہ ہے کہ تمہیں اپنی گرفت میں لے کر تمہارے جسم کو توڑ پھوڑ دینا چاہتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ تم اس کی اذیت پسندی کا شکار ہو جاؤ، خود اسے ہی اپنی گرفت میں لے کر سفید برش پھیر دو اور پھر سوچو اور اپنے تخیل کو اتنی بلندی پر لے جاؤ کہ تمام رنگ و نور ایک نقطہ پر منجمد ہو کر ستارۂ حسن بن جائیں۔

دیکھو! تمہارے داہنے طرف جہاں تمہاری انگلی رکھی ہے، ایک ننھا طائر گلاب کی شاخ پہ بیٹھا تم کو اس طرح گھور رہا کہ جیسے تم محض جگنو ہو اور جس میں چمک اور روشنی کے باوجود کوئی گرمی نہیں۔

دیکھو اس سیاہ کیڑے کو دیکھو جو سرخ گلاب کی ایک شاداب پنکھڑی پر اپنے ننھے ننھے اور سیاہ ہاتھوں سے ساز بجا رہا ہے۔ ایک ایسا ساز ترتیب دے رہا ہے جس سے ایک ایسا نغمہ پھوٹے گا جو شاخ کی کلیوں میں نغمۂ احساس پیدا ہوتے ہی حیا کے بوجھ سے شبنم ٹپکے گی، خوشبو پھیلے گی۔

لیکن تم لاشعور کی ایسی باتیں سوچتے ہو کہ ننھے پرندے بھی تمہاری عقل و دانش پر شبہ کرنے لگتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ وہ اس سے پہلے کہ تم کو اپنی گرفت میں لے اور تم پر غالب ہو جائے، تم اس کو اپنے آہنی پنجوں میں سمیٹ کر اس کے چہرے پر جذبات کی سرخ شئے ڈال کر قلم تراش چاقو سے تمام منتشر لفظوں کو بے ترتیب لکیروں کو اور بھیگے رنگوں کو گہری سرخ درازوں میں دفن کر دو۔ وہ لاکھ چیخے اور تمہاری گرفت سے نکل جانا چاہے مگر تم اپنی گرفت سخت تر کرتے جاؤ اور اس کے تمام جسم پر خیال کی گیرائی معنی کا حسن، رنگوں کا امتزاج اور جذبے کی رعنائی مرتسم کرتے جاؤ اور اگر زیادہ مزاحمت پر آمادہ ہو تو اسے رنگ و نور میں اتنا تحلیل کر دو کہ اس کی سسکیاں گھٹ کر رہ جائیں اور اس کی تمام پیش رفت اور مدافعت تمہارے مضبوط ارادے کی گرفت میں سست پڑ جائے۔

اسی صورت میں ہی وہ پورٹریٹ اپنی سابقہ شخصیت کے کھو جانے پر پگھل جائے گا، موم بن جائے گا اور اس کے اس احساسِ شکست میں اس کی ساری عفریت چاولوں کے پیچ کی طرح بہہ جائے گی اور اس کی سخت اور گہری بے سر باتیں اور خطوط ٹوٹ کر اسے بہتے سیال میں تحلیل ہو جائیں گے اور نقطۂ ابال کے بعد جب وہ سیال نقطۂ انجماد پر پہنچے گا تو وہ پورٹریٹ گلاب کی پنکھڑی کی طرح دلکش اور پُر کشش نظر آئے گا۔ اس وقت تمہارا فن تمہارے اس خیال کی رفعتوں کو چھو لے گا جو ایک فنکار کا خواب ہوتا ہے — اور ایک ایسی تخلیق کی بازیافت ہوگی جو تمہارے دائمی حیات کی ضامن ہوگی۔

تو جاؤ اس عقل مند انسان کی طرح ذہین، فنکار کی طرح جو اپنی بقا اور تحفظ کے لیے کرتا ہے، اسی طرح تم بھی اپنی بقا اور تحفظ کے لیے اپنی انا کی تسکین کے لیے اس پورٹریٹ کے فخر و غرور، نخوت و سرور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔

اٹھو! تم کیسے مصور ہو، کیسے فنکار ہو، کیا تم فن کے اس اصول سے واقف نہیں کہ جو جامد ہو جائے وہ فن نہیں۔ ہر فن اپنے اندر ارتقائی حسن رکھتا ہے۔ تمہیں شاید رنگوں کے بکھر جانے کا افسوس ہے، خیال ہے، لیکن یہ محض تمہارا واہمہ ہے۔

دیکھو! ادھر دیکھو! وہ پورٹریٹ کے چہرے پر قوس و قزح پھیلتی جا رہی ہے اور تمہاری پیشانی بھیگتی جا رہی ہے اور ماتھے کی سطح پر سر کے لرزیدہ بال منتشر ہوتے جا رہے ہیں۔ آنکھوں میں چمک بھی ہے اور دلوں میں دھڑکن بھی لیکن تم تخیل کی وادی میں اتنی دور تک جا چکے ہو کہ تمہیں کچھ ہوش نہیں رہا۔ ذرا اپنے عقب میں دیکھو، ایک شعلہ آتشیں تمہارے قدموں کے نشان پر میخیں ٹھونکتا جا رہا ہے۔ مگر تم عقل و شعور سے کوئی کام لینے کے لیے تیار نہیں۔ مگر یاد رکھو ایسی زندگی اپنے ارد گرد ایسی لمحاتی دنیا آباد کرتی ہے جس کا ہر لمحہ کسی مخصوص لمحہ سے اسی وقت قائم کرتا ہے جب کوئی ذی شعور کسی لمحہ کو اہمیت دیتا ہے — اور ہر لمحہ اپنے لمحاتی لمس سے ایک ایک لمحہ کو پراگندہ کر دیتا ہے، بکھیر دیتا ہے۔ مگر شاید تم اس لمحہ کی قدر و قیمت کا یقین نہیں کر سکتے اس لیے یہ لمحہ اپنے جلو میں انتشار لاتا ہے۔ ایسا انتشار جو تمہارے ایک لمحہ میں پوشیدہ ہے۔ اب اگر تم چاہو تو اس لمحہ کو ایک خوشگوار لمحے میں تبدیل کر سکتے ہو۔

ورنہ... تم... رنگ... تخیل... وادی... لمس... کئی لمس... صرف ایک... ایک... انتشار... پراگندگی...

اور... بس... وہی ایک لمحہ... جو...؟

۱۹۷۳ء

تنکا

ایک لڑکی تھی ــــ

خوبصورت جامہ زیب، جس کی آنکھوں میں جھیل کی نیلاہٹیں تھیں۔ جس کی زلفیں سیاہی مائل بھورے رنگ کی تھیں۔ جس کے رُخساروں پر گلاب کی پتیاں بکھری رہتی تھیں۔ جس کے خوبصورت ہونٹوں پر شفق کی سرخی پھیلی رہتی تھی۔

ہاں!

وہ ایک ایسی ہی لڑکی تھی۔ کم گو، جس کی شخصیت میں مدّ و جزر جیسی کیفیت تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جانا اور من جانا اُس کی فطرت تھی۔

میں نے بارہا اُس کے رس بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کو آنکھ مچولی کھیلتے دیکھا ہے۔ اُس کے لانبے لانبے بالوں میں چاندنی راتوں کی کیف آور سانسوں کو مجسم ہوتے دیکھا ہے۔

اُس کے چہرہ پر صبح کی تنویر اور شام کی سرخی مچلتی دیکھی ہے۔ میں نے بارہا اُسے درجہ میں خاموش خاموش نظروں سے اُس کے گنگناتے ہونٹوں کو، مسکراتے رخساروں کو اور سیاہ زلفوں کو بل کھاتے دیکھا ہے۔

کئی خوبصورت لڑکیوں میں مجھے وہی اچھی لگی تھی۔ میں نے بار بار اپنی نظروں کو اُس کے چہرے کا طواف کرتے دیکھا تھا۔

اکثر میں مبہم سا خواب دیکھا کرتا تھا۔

ایک سجا ہوا کمرہ ہے، پھولوں کی مسہری ہے، ریشمی کپڑوں میں سمٹی سی، شرمائی سی نا ہیل...

میرا دل اُس کو پالینے کی آرزو میں مچلا کرتا تھا۔

لیکن میں سوچتا تھا کہیں یہ پالینے کی آرزو دُکھ کا سمندر نہ بن جائے — میں اُس کے خیالوں سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا — لیکن ہر بار اُس کا حلیم چہرہ، دہکتے تپتے صحرا میں آبشار بن کر چھا جاتا۔ چاندنی کا کیف، پھول کی خوشبو، صبح کاذب کی نغمگی، مجھے جانے کہاں کہاں لے جاتی...

نا ہیل نے میری طرف دیکھا تھا — میں نے اُس کو دیکھا تھا — ہم دونوں کی نگاہیں ملی تھیں — لیکن — دونوں کے درمیان کچھ تھا۔ وہ کیا تھا "ایک لمحہ" جو آتا اور چلا جاتا۔

میرا دل کسی کو پالینے کی آرزو میں کبھی اتنا بے قرار نہ ہوا تھا۔ شدتِ احساس نے کبھی ایسی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ دل کی خلش نے ایسی جانی پہچانی صورت کبھی نہ اختیار کی تھی۔

پھر بھی جانے کیوں دل میں ایک تیز و تند خواہش جاگ اُٹھی تھی کہ وہ نا ہیل کو ہمیشہ کے لیے اپنا لے۔

نا ہیل!

جی!

ایک بات کہوں؟

کہیے۔

مجھے پروفیسر ساجدؔ کے نوٹس چاہئیں۔

نوٹس؟

جی ہاں! میں کل نہیں آسکا تھا۔

نا ہیل نے اثبات میں سر ہلا کر اقرار کیا تھا۔

اِس تمہیدی گفتگو نے اُس کی قربت بخشی تھی۔

ہم دونوں روز ملنے لگے تھے۔

ایک دن میں نے کہا تھا۔

"ناہیل! تم میری افکار ہو، ایک شاعر کے تخیل کا روپ سنگھار ہو۔"

ہوں۔

لیکن۔

تم بہت معصوم ہو— ناہیل چہکی۔

میں آپ کی نظموں کو بڑے پیار سے پڑھتی ہوں۔

لیکن میں زیادہ اُردو نہیں جانتی۔

کیا آپ مجھے اُردو پڑھا دیں گے؟ اُس نے پوچھا۔

ہاں— کیوں نہیں—

لیکن—

تم خود بھی تو اُردو ہو، خوبصورت اُردو۔ جس میں میر کا حسن، غالب کی فکر، مومن کی شوخی، مجاز کی غنائیت، اختر کا رومان اور فیض کا لہجہ— تم میں کیا نہیں ہے ناہیل؟

دیکھو اپنی طرف دیکھو— میری آنکھوں سے دیکھو۔

تمہیں دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ تمہارے بال بکھیر دوں، تمہارے شانے پر سر رکھ کر سو جاؤں—

اور— اور— اور— تم زندگی کی حسین آنکھوں میں ایک آسمانی خواب بن کر چھا گئی ہو۔

میں خواب ہوں، نہیں— میں حقیقت ہوں— کاش میرے زخم ہنس کر گلاب ہو جاتے— کسی کا اُداس، ملول دل اُس کی خوشبو سے شاداب ہو جاتا۔

کبھی کبھی میں اُس کی یادوں میں کھو جاتا ہوں۔ وقت کی بھٹی نے اُن تاباں و درخشاں لمحات کی ساری درخشندگی اپنے اندر جذب کر لی تھی اور اُس کی راکھ میں نے اپنے دامن میں بھر لی تھی۔ وہ میری زندگی کا خوبصورت باب تھی... جس کے لفظ لفظ میں اُس کی محبت، اُس کا خلوص، اُس کی چاہت ثبت ہو گئی تھی۔

لیکن—

وہ کتاب مکمل ہونے سے پہلے نشر ہو گئی، اُس کے اجزاء پریشان ہو اُٹھے۔ وہ ایک بہار کے جھونکے کی طرح آئی— چند بوندیں برسیں— پھر وہی دھوپ، وہی تپتی زندگی، وہی بوجھل سناٹا—

جانے کیوں اتنی دور— ایسی دوری— جو شاید میری سیمابیت کا نتیجہ ہو— لیکن— میں نے

اس دوری کی طنابیں نہیں کھینچی۔

ہاں تو —

ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے دور تک ٹہلتے رہتے تھے۔ کالج کے کمپاؤنڈ میں ایک بہت لمبا برہڑ کا درخت تھا جس کی ڈال سرسراتی، بل کھاتی ہوئی ٹیوب ویل تک چلی گئی تھی۔ کیسے پیارے پیارے "برہڑ" لگتے۔ کیسی پیلی پیلی سرخی تھی۔ ہلکی سرخی لیے وہ برہڑ کس طرح ڈالوں پر ٹنگے ہنستے دکھائی دیتے تھے۔ ان ڈالوں پر منہ بند کلیاں پھوٹتی تھیں۔ پھر ان کلیوں میں شہابی رنگ کے پھول کھلتے تھے۔ پھر اُن کے جھڑنے کے بعد چھوٹے چھوٹے، ہرے ہرے "برہڑ" پیدا ہوتے اور بڑھتے بڑھتے شہد کی ڈولیوں میں لٹکنے لگتے تھے۔ جب پک جاتے تھے تو جگہ جگہ پیلے ہوجاتے اور اُن میں دانت گڑو دو تو اُن میں سے نارنجی رنگ کی طرح رس نکلتا تھا۔ جب بہار آتی تھی تو اِتنے رنگوں کو لے کر آتی تھی، اتنے پرندوں کی چہکاریں لے کر آتی تھی کہ اُن کے پیچھے بھاگنا مشکل ہوجاتا تھا۔

ہم دونوں انہی پکے پکے، پیلے پیلے برہڑ کے سائے میں گھومتے رہتے۔ جب بیٹھتے تو ہر لمحہ یہ خواہش ہوتی وہ بیٹھی مجھ سے باتیں کیا کرے۔ اپنی، اپنے گھر کی، دہلی کی اور....

میں نے اُس سے کہا تھا۔

میری آرزو— تم میری زندگی کا خوبصورت عنوان ہو۔ میں تمہاری ان نیلی آنکھوں میں ڈوبتا جاتا ہوں—

جلیس۔

میں چونکا تھا— خیالات سگریٹ کے دھوئیں کی طرح بکھر گئے تھے۔ میں نے اُسے بغور دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے گلاب اور گیندے کے پھول گلنار ہوگئے ہوں۔

کیا دیکھ رہے ہیں— میری طرف گھور گھور کر۔

یہی کہ تم پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئی ہو۔

اچھا— وہ ہنسی، دودھ ایسے سفید دانت موتیوں کی طرح چمک اُٹھے تھے۔

ہم دونوں محوِ گفتگو تھے۔

میں نے اُس سے کہا تھا— تمہارے لب کی نرمی گلاب کی پتیوں سے کہیں زیادہ کیف بخش ہیں— آؤ چلیں—

میں نے اپنی اس پیاسی اور کھوئی ہوئی زندگی میں برسوں بعد یہ پہلی پُر سکون رات کاٹی تھی۔ ایسی رات جس میں محبوب کا حسین خیال ہوتا ہے۔ زندگی کی رعنائیاں — ایسی رعنائیاں جن میں البیلے خوابوں کی گنگناہٹیں ہوتی ہیں، ایک زندگی کے مہکتے نشان ہوتے ہیں۔ وہ منزل جس کے لیے چاند نغمات بنا کرتا ہے، نسیم آوارہ پھرا کرتی ہے۔

میں تمہیں پا کر زندگی کی تمام تلخیاں بھول گیا ہوں۔ تمہاری شگفتہ مسکراہٹ سے ذہن کی ساری گرہیں کھل گئی ہیں۔ تمہیں پا کر زندگی بڑی خوبصورت ہوگئی ہے۔

ناہیل کو اُس نے چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا۔

ناہیل! تم میرے لیے ہو، میں تمہارے لیے ہوں۔ کیا یہ سچ ہے؟

ہاں —! اُس نے نظریں جھپکاتے ہوئے کہا۔

ناہیل! آؤ تمہیں میں اپنی زندگی کے وہ اَوراق دکھاؤں جن میں تمہاری تصویر اور آرزوئیں ثبت ہوگئی ہیں۔ دیکھوگی — دیکھو — میری آنکھوں میں دیکھو۔

آنکھیں بھر آئیں — کہیں سے اُڑ کر ایک تنکا — آنکھوں کی پتلیوں پر جم سا گیا — تصویر کی لکیریں رنگ نہ پا سکیں۔ ہماری ملاقاتیں راس نہ آئیں — ہمیشہ کی طرح وقت کا ناگ اُسے ڈس گیا — میرا خوف سچا تھا — اس میں رعنائی کہاں — میرے وجود پر یہی خوف کا سایہ منڈلاتا رہا ہے اور شاید ہمیشہ وحشتوں کے سائے منڈلاتے رہیں گے —!!

———— ۱۹۷۲ء

تحفہ

بارش بڑے زوروں سے ہورہی تھیں، مجبوراً وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی زندگی مفلس کی قبا کے مانند تھی جس میں ہر گھڑی کے پیوند لگے ہوتے ہیں۔ اس نے طبیعت بہلانے کے لیے فلسفہ کی ضخیم کتاب کھولی لیکن بھوک کے آگے ایک نہ چلی۔ وہ تنہا کھڑا کھڑا اُکتا گیا، پاس ہی بورڈنگ سے قہقہوں کی آواز آرہی تھی لیکن اس نے وہاں جانا بے کار سمجھا اور وہیں کھڑا ہوکر بارش کے رُکنے کا انتظار کیا۔ گھڑی نے پانچ بجائے۔ خدا خدا کرکے بارش بھی رُکی اور تیز قدم اُٹھاتا گھر کی طرف روانہ ہوا۔

جب وہ اپنے محلہ کی تپلی، اندھی، لولی، لنگڑی گلی میں پہنچا تو اس نے احتیاط سے پائجامہ کے پائچہ کو اُوپر اُٹھایا۔ میونسپلٹی نے اس محلّہ کو بالکل نظر انداز کردیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی غریبوں کو صفائی انتظام، روشنی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس گلی میں بارش کی وجہ سے اتنی کیچڑ تھی کہ قدم اُٹھانا محال تھا۔ انیس بدقت تمام اپنی کوٹھری تک پہنچا، اس نے دروازہ کھولا۔ سیلن کی تیز بدبو اس کے دماغ کو چڑھ گئی۔

ارے آج تو کوٹھری بُری طرح ٹپکی ہے۔ سونے کا بھی ٹھکانہ نہیں۔ بستر اور بکس سب بھیگ گئے۔

اس نے اپنے ٹوٹے ہوئے بکس کو جو پانی میں شرابور تھا، اُٹھا کر دوسرے کونے میں رکھ دیا اور چارپائی جو متعدد بار بھیگنے کی وجہ سے کالی پڑگئی تھی، جس کے بان بوسیدہ اور بے حد ڈھیلے تھے، دیوار کے

سہارے کھڑا کر دیا۔ شکر ہے کتابیں بچ گئیں — اس نے اپنے ہاتھ کی کتابیں الماری پر رکھ دیں اور وہیں سے بے رنگ سالن کی رکابی اور اس پر رکھی ہوئی روٹیاں اُٹھالیں۔ اس کی آدھی بھوک کھانا دیکھ کر ہی غائب ہوگئی۔ اس نے پانی اور بے رنگ سالن کی مدد سے دو روٹیاں پیٹ میں اُتار لیں اور بچوں کو پڑھانے چل دیا۔ انیس ۱۹۴۷ء کے طوفان کا اکھڑا ہوا پودا ہے۔ افلاس و نکہت کا زہر اس کے رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اُس کے ماں باپ فساد کے نظر ہو چکے ہیں۔ وہ بہ مشکل اپنی تعلیم جاری رکھ سکا ہے۔ اس کے آبا و اجداد نے پنجاب کی بنجر زمین میں اپنی محنت سے بہار کے پھول کھلائے تھے۔ وہ مورانوالہ کا بوٹا تھا جب ایک بوٹے کو اس کے جغرافیائی اس کے مخصوص آب و ہوا، اس کی زمین سے اکھاڑ لیا جائے تو دوسری جگہ اس کی کاشت بہ مشکل ہو سکتی ہے۔ اس معمولی امر کو ہر کسان سمجھتا ہے۔ اس کے قدم الٰہ آباد کی بوسیدہ گلی میں نہ جمتے تھے۔ اس کی جڑیں اس کی غذا قبول نہ کرتی تھیں۔ اس کی رگیں مرجھانے لگی تھیں۔ وہ تندرست پودا نہ تھا۔ اس کا جسم لاغر ہو گیا تھا۔ اس کے رخسار پچک گئے تھے۔ انیس بدقت تمام اپنی کہانیوں کے معاوضہ پر گزر اوقات کرتا تھا۔

دو گھنٹہ کی دماغ پاشی سے وہ بالکل خستہ اور بے حال ہو گیا تھا۔ ٹیوشن کے بعد تھکے تھکے قدم اُٹھائے گھر کی طرف چلا۔ آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔ چاند اسے جلی روٹی کی طرح نظر آ رہا تھا کہ کسی نے اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

''اوہ ناہید'' — انیس چونک پڑا۔

''ہُم'' — اس کی آنکھیں جادوگری پر مائل تھیں۔

''آپ؟''

''میں آپ سے ملنے کا کئی روز سے ارادہ کر رہی تھی لیکن کالج میں موقعہ نہ ملا'' —

''میرے لائق کوئی خدمت؟'' —

''میں آپ کو ایک تکلیف دینا چاہتی ہوں'' —

''فرمایئے'' — (انیس متحیر تھا)

''میں آپ سے اقبال کو پڑھنا چاہتی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اردو لٹریچر لے کر پچھتا رہی ہوں اب امتحان سر پر ہے اور مجھے اقبال کے بارے میں کچھ نہیں معلوم'' — ناہید دلفریب انداز سے مسکرائی۔

''بسر و چشم'' — انیس نے اطمینان سے سانس لیا۔

''کیا اقبال کی شاعری میرے سمجھ میں آجائے گی۔''

''اقبال کی شاعری بے حد آسان ہے۔ جب آپ پڑھیں گی تو لطف آنے لگے گا۔''

انیس حیران تھا کہ ناہید جو کالج کا مقصد صرف سیر و تفریح اور ہنسی مذاق خیال کرتی تھی، امتحان میں کیوں اتنا انہماک دکھا رہی ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا— ''اس سال آپ خلاف معمول امتحان سے دلچسپی لے رہی ہیں۔''

''سنتوشی کہتی ہے کہ وہ امتحان میں مجھ سے زیادہ نمبر لائے گی یہاں تک کہ اُردو میں بھی— میں دکھانا چاہتی ہوں کہ وہ ذہانت میں میرے برابر نہیں، حالانکہ مجھے ادب سے ذرا بھی دلچسپی نہیں— سائنس کی ترقی کے اس عہد میں ادب کی تعلیم فضول ہے۔ ادب اور سائنس ایک دوسرے کے راستے میں حائل ہیں۔ ادب میں الف لیلیٰ کی باتوں کے سوا کیا ہوتا ہے۔''

''آپ کا یہ خیال بے بنیاد اور غیر سائنسی ہے۔ ادب اور سائنس ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ ایک کی ترقی دوسرے کی تنزلی کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ادب انسانوں کو خواب دیکھنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور سائنس ان خوابوں کی تعبیر تلاش کرتی ہے۔ اچھا ادب نہ آج سے پہلے خلا میں پیدا کیا جاسکتا ہے نہ آج پیدا ہو رہا ہے اور نہ کل اس کی کوشش کی جائے گی۔ سائنس جب سارے بکھیے اُدھیڑ کر حقیقتوں کو سمجھ لیتی ہے تو ادب پھر پیرہن تیار کرتا ہے۔ اس قسم کی الٹی سیدھی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو انسان کو صرف خارجی جانور کی حیثیت سے دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ محترمہ! داخلی زندگی کمزور اور فانی انسانوں کے لیے بہت بڑا سہارا ہے۔ انسان محض مشین گن کبھی نہیں بن سکتا۔ یہ دونوں زندگیاں دونوں پر اثر انداز ہوتی ہیں... اور ان کی ہم آہنگی ہی صحت مند انسان پیدا کرتی ہیں۔ اس لیے آج یہ بات ہمیشہ سے زیادہ اہم ہے کہ ادب اور ادیب کو اس کا جائز مقام سماج میں ملنا چاہیے جس کا وہ مستحق ہے، ورنہ انسان یا تو سائنس کی ترتیب سے بغاوت کرکے ایک جذباتی جانور بن جائے گا یا اپنی اپنی ایجاد کردہ کلوں کے بھیڑ سے راستہ گم کردے گا''—

''اوہ گڈ''— ناہید نے تالی بجاتے ہوئے کہا— ''آپ کے بولنے کا انداز بہت دلکش ہے غالباً— مستقبل میں سیاسی اکھاڑا میں اُترنے کا ارادہ ہے— انیس صاحب! کیا آپ کانگریسی ہیں''—

''نہیں۔''

''پھر یہ کھدر...''

"میں کپڑوں کی سیاست کا قائل نہیں ہوں۔ یہ میں اس لیے پہنتا ہوں کہ یہ سستا اور مضبوط ہوتا ہے۔ صرف چودہ آنے گز ہے محترمہ"۔۔۔

"یہ آپ نے محترمہ محترمہ کی کیا رٹ لگا رکھی ہے"۔۔۔ ناہید چڑھ سی گئی۔

"ناراضگی کا سبب"۔۔۔ وہ سنجیدہ ہوگیا۔

"کسی نوجوان لڑکی کو محترمہ نہیں کہنا چاہیے، وہ بہت بُرا مانتی ہے۔ مجھے تو اس لفظ سے چڑھ ہے"۔۔

"کیوں؟"

"یہ لفظ ضعیفی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دیکھیے نا میں ضعیف نہیں ہوں"۔۔۔ اس کے لہجہ میں ریشم کی لچک تھی۔۔۔

انیس اس "ریسرچ" پر تلخی سے مسکرایا۔۔۔

یہ اردو غزل سی دھان پان، الھڑ، نازک خیالی کی زندہ مثال لڑکیاں بھی کیسے کیسے ستم ڈھاتی ہیں۔ ان کی دنیا بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ انیس نے ان خیالات کے بھنور سے نکلتے ہوئے ناہید سے کہا۔۔۔ "اچھا اجازت دیجیے۔"

"چلیے میں آپ کے مکان تک آپ کو چھوڑ آؤں"۔۔۔ وہ کار کا پٹ کھول کر کھڑی ہوگئی۔

"شکریہ۔۔۔ میں ذرا ٹہلتا ہوا گھر واپس جاؤں گا۔"

"نہیں، آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا"۔۔۔ ناہید نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

"بات یہ ہے کہ میرے گھر تک آپ کی کار نہیں جا سکتی۔ غریبوں کا بھلا گھر کیا ہوگا"۔۔۔

"یعنی؟ اچھا میں سمجھی۔۔۔ لیکن ایسے غلیظ مکان انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں۔ آپ وہاں کیوں رہتے ہیں؟"

"وہاں سب آدمی ہی رہتے ہیں"۔۔۔ انیس نے آہستہ سے کہا۔

ناہید اس کے طنز کو سمجھ گئی اور مسکرا کر بولی۔۔۔ "خیر! لیکن میں آپ کو وہاں نہ رہنے دوں گی"۔۔۔

انیس نے انکار کرنا چاہا لیکن ناہید نے اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کے منھ پر رکھ دیا۔

"ابھی چلیے میرے ساتھ"۔۔۔ وہ شیریں لیکن تحکمانہ لہجے میں بولی۔

"میرا سامان"۔۔۔ انیس نے رستگاری حاصل کرنے کے خیال سے کہا۔

"وہ کل آجائے گا"۔۔۔ ناہید نے انیس کو کار میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

اس رات وہ ٹھیک سے سو نہ سکا اور کچھ عجیب سی خوشبوئیں، پرچھائیاں اس کی نیند کی نازک دنیا میں لرزتی رہیں۔ ایک عجیب سی صحت افزا کنواری خوشبو اس کے دل پر چھا گئی۔

ناہید غیر معمولی حسن کی مالک تھی اور وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جن پر مغربی تعلیم کم اور مغربی تہذیب زائد اثر کرتی ہے۔ وہ کالج میں خواہ علم حاصل کرسکیں یا نہ کرسکیں لیکن ان کو نقرئی قہقہے لگانا، مصنوعی چیخیں مارنا خوب آجاتا ہے اور اچھی طرح واقف ہو جاتی ہیں کہ غازہ کریم، پاؤڈر سے کیسے سینما کے اشتہار بنا جاسکتا ہے۔ کیسے سر کے بالوں میں ٹیڑھی گھاٹیاں، وادیاں، مرغزار بنائے جاسکتے ہیں۔ کیسے تنگ کمر کے نیچے پھیلے ہوئے متناسب کولھے پر فرنچ ساڑی سے شوخ بہاؤ پیدا کیا جاسکتا ہے، جو اس پہاڑی ندی کی یاد دلائے جس کی لہروں کے جھٹکوں سے کوئی انسان سنبھل نہ سکے۔۔۔

اب تک انیس کی زندگی بے کیف اور ویران تھی اور کتنی مدتوں بعد آرزوؤں کے دامن میں ایک پھول کھلا تھا، شاداب اور روشن۔۔۔

انیس کو کوٹھی میں آئے دوسرا مہینہ تھا۔ ایک دن ناہید اپنی ایک سہیلی کے یہاں چلی گئی۔ اس دو ماہ کے عرصے میں پہلا موقعہ تھا کہ ناہید اس سے علیحدہ ہوئی تھی۔ انیس اس کے بغیر بے چین تھا۔ اس کو ہر لمحہ اس کی یاد ستارہی تھی۔ اس کا کتابوں میں بھی دل نہ لگتا تھا۔ وہ تمام دن کروٹیں بدلتا رہا۔ آج احساس ہوا کہ ناہید اس کے دل کی گہرائیوں میں اس طرح سما گئی ہے جیسے گلاب کی پنکھڑیوں میں خوشبوؤں کے ڈھیر یا شمس و قمر میں روشنی کا زیر و بم۔۔۔

انیس اپنے پلنگ سے اُٹھا اور کمرے کا دریچہ کھول دیا۔ آسمان پر ابر کے آوارہ ٹکڑے تیر رہے تھے۔ فضا میں رومانی خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔۔۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ناہید اس طرح اس کی زندگی میں آئی جیسے کوئی بگولہ صحن میں گھوم جائے۔ ابھی تو بات ابتدائی مرحلوں میں تھی لیکن اس کے جذبے اور اس کی معصومیت کے بارے میں سوچتا تو مدہوشی سی چھا جاتی۔۔۔ دنیا میں محبت کسی سے بھی ہو، بغیر جذبے کے ایک سنگلاخ چٹان کی طرح ہے۔ وہ محسوس کرتا جیسے ناہید کے لبوں کے پھول کھلتے ہیں۔ اس کی نگاہوں کی کلیاں اسی کے لیے چٹکتی ہیں۔ وہ کائی دھیرے دھیرے سوکھنے لگی جسے دھرتی کے ظالم ہاتھوں نے جنم دیا تھا۔ تب ہی اس کے ذہن میں ناہید کا چہرہ، چاند کا نور، پھولوں کی مسکراہٹ دو خوبصورت خوبصورت ہونٹ اُبھر آئے۔ اس کے ذہن میں لوبان کی خوشبو پھیل گئی۔ چند منٹ بعد ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ انیس

پر وارفتگی چھا گئی، وہ گنگنانے لگا۔

"ترا حسن دست عیسیٰ تری یاد روئے مریم"

وقت گزرتا گیا — وہ آج خوابوں کے انگنت آذر کدے بنائے خیالوں میں محو گنگناتا رہا۔

"انیس" — کمرے میں ایک شیریں نغمہ گونجا — ناہید نے سوئچ دبا کر روشنی کردی۔

"کہاں رہیں آج — میں دن بھر تم کو یاد کرتا رہا۔"

"کیوں؟" جیسے کوئی کلی چٹکی ہو، پتوں کا جھومر ہوا میں ہلا ہو۔

ناہید اس وقت ہلکے نیلگوں لباس میں ملبوس تھی۔ اس کا مسکراتا چہرہ بڑا دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے چاند مغربی افق پر شفق کی آخری لکیر پر محجوب، شرمایا ہوا نظر آیا ہو اُس مہ وش ساقی کی طرح جس نے اپنے دست سیمیں میں پہلی بار مینا اُٹھائی ہو۔

اس کی ٹھوڑی کی جلد ناشپاتی کی طرح بے داغ تھی۔ نیچے گردن اور سینے کا اتصال پر ایک گڑھا تھا جس پر ایک رگ تڑپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو اُٹھا تھا۔ اس کی برہنہ باہیں بے حد خوبصورت نظر آرہی تھیں —

"تمہارا حسن مرحبا ناچ کی طرح چنچل ہے" — انیس تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"سچ" — اس نے کہا۔

یکا یک بادل زور سے گرجا۔ بجلی کی تیز روشنی نکلی، روشنی دور تک سنہرا آئینہ جڑتی گئی۔ ناہید نے ڈر کر چیخ ماری اور انیس کے آغوش میں آگری جیسے کسی رومانی شاعر کے ذہن میں کوئی خوبصورت سا مصرع اٹک گیا ہو۔ یہ سب کچھ آناً فاناً تمام منزلیں طے کر گیا ہو۔ اس کی سانس تیز ہو گئی تھی، اس کے چہرہ کا رنگ سپید سے سرخ اور سرخ سے گہرا سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے ہونٹ آتشیں ہو گئے تھے۔ اس نے اس کے ہونٹوں کی آگ کو پی لیا اور وہ ساری کی ساری آنچ میں گھل گئی۔

ناہید، اس بندھن کو توڑ نہ دینا — اس کی سرگوشی میں اجنبی عطر کا پیام تھا۔

ناہید اس کے آغوش میں زلف بکھرائے مسکرا رہی تھی۔ جبیں عرق آلود ہو رہی تھی جیسے گلاب کی پنکھڑی پر شبنم کے موتی۔ اس کی مسکراہٹ میں جادوئے نیم شبی مجسم ہو رہی تھی۔

انیس زندگی کے اس نرم و نازک اور رنگین آغوش میں چھ ماہ تک مسرت اور شادمانی کی مہتابی راتیں گزارتا رہا۔ دھرتی پر قوس و قزح لوٹتی رہی، اس کے رنگ بکھرتے رہے — امتحان آیا۔ ناہید کے

پرچے بہت عمدہ ہوئے — انیس نتیجہ کا منتظر تھا۔ ایک روز نتیجہ بھی آ گیا۔ انیس نے بے چین دل اور کانپتے ہاتھوں سے اخبار کو کھولا۔ پہلے ورق پر حسب معمول جلی حروف میں خود اس کا نام تھا — اس نے ورق اُلٹا اور لڑکیوں کی فہرست پر نظر ڈالی — ناہید اوّل تھی — انیس خوشی سے ناچنے لگا — وہ بھاگا بھاگا ناہید کے پاس پہنچا۔

"مبارک ہو ناہید" — اس کی آواز فرط مسرت سے کانپ رہی تھی۔

"تم بھی اوّل آئے ہو — مبارک ہو" — ناہید کا چہرہ جوش مسرت سے گلنار تھا۔

"ایک اور خوش خبری سناؤں" — اس نے پُر حجاب لہجہ میں کہا۔

"کیا؟" — انیس نے اشتیاق سے دریافت کیا۔

"میری شادی ہو رہی ہے" — اس نے نیم وا مخمور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

انیس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے جسم کا رُواں رُواں قہقہے لگا رہا ہے۔ فضا اس کا مذاق اُڑا رہی ہے۔ ناہید کی پر سطوت کوٹھی اسے ڈانٹ رہی ہے۔ اس کے چہرے کی رنگت اڑ گئی — زبان ساکت ہو گئی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ناہید کو دیکھا — اور پوچھا۔ "یہ تمہارا انتخاب ہے؟"

"ہاں" — اس نے بے پروائی سے اپنے بالوں میں پھول لگاتے ہوئے کہا — انیس کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"اس موقعہ پر تم مجھے کیا تحفہ دو گے انیس؟" —

"— تحفہ؟" — انیس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکل کر زرد رُخساروں پر بہنے لگے اور پھر وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے حویلی کے باہر نکل گیا۔

———— ۱۹۶۱ء

قصہ آدھے فرلانگ کا

سردی کا احساس کم ہوگیا تھا اور سورج بادلوں سے دھیرے دھیرے جھانکنے لگا تھا۔ کہر کی تہیں چھٹنے لگی تھیں۔ سلیمؔ سامنے کھیت کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے اس پہاڑی ٹیلے کو دیکھنے لگا جہاں نشیب میں اس کے چنے کے کھیت تھے۔ مشرق سے اُگنے والے سورج کی کرنیں سردی سے کانپ رہی تھیں۔

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوگیا۔

ایک رکشا اس کے مکان کے نیچے سے گزر گیا جس پر ایک خوبصورت لڑکی سرمئی شال ڈالے بیٹھی تھی۔

سلیم کو وہ صورت جانی پہچانی معلوم ہوئی۔

اس کا استعجاب بڑھا تو اس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو پورٹیکو میں رکشا کھڑا تھا اور وہ رکشے والے کو پیسے دے رہی تھی۔ نیچے فرش پر ہولڈال اور جھابی رکھی تھی جس میں سرخ سرخ امرود جھانک رہے تھے۔

سلیم نے ذہن پر بے حد زور ڈالا۔ آخر یہ کون لڑکی ہوسکتی ہے؟

جلدی جلدی کمرے کی میز پر سے شراب کی بوتلیں اور پیالیاں سیف میں بند کیں اور مہمان کا

شوق و اضطراب کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔ اُسے لڑکیاں بے حد پسند تھیں۔ کریم کلر کی لڑکیاں تو اُسے دل سے بھاتی تھیں۔ خوبصورت، نرم و نازک، پھول سے بھری ڈالی جیسی، جس پر جھوم جانے کی خواہش جاگ اُٹھتی۔ تشنگی ہونٹوں کی سلگ اُٹھتی اور خود کو سپرد کردینے کی شدت سے بے تاب ہوجاتا تو سگریٹ کے دھوئیں میں اپنے جذبوں کو تحلیل کردیتا۔ یہاں تک کہ نڈھال و خستہ قدموں کو ''کیفے سکون'' کی طرف لا ڈالتا اور اپنی تھکی تھکی آنکھوں سے کچھ خلا میں گھورنے لگتا۔ جانے کیوں ایسا ہوجاتا ہے۔ وہ سوچتا؟ ایسا بھی نہیں کہ ہر لڑکی اُسے متاثر کرے۔ وہ اس قدر بدذوق بھی نہ تھا کہ ہر لڑکی کے متعلق سوچنے لگے۔ مگر یہ نووارد لڑکی اُسے اچھی لگی تھی۔

وہ دروازے پر رُکی، مسکرائی، آداب کیا۔

آپا نہیں ہیں کیا؟

آپا؟

کون آپا؟

نہیں؟

اسپتال میں ہیں۔

آپ کون ہیں؟ میں نے آپ کو نہیں پہچانا!

اس نے نقرئی تبسم کیا اور بولی۔ مجھے نشی کہتے ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کر رہی ہوں۔ موسم سرما کی تعطیل ہوئی تو سوچا ''تلسی پور'' گھوم آئیں۔ آپا سے ملاقات بھی ہوجائے گی اور تفریح بھی۔

نجمہ کی تو اور کوئی بہن نہیں۔ آپ کا اُن سے کیا رشتہ ہے؟

نجمہ آپا میری بہت پیاری دوست ہیں۔ ہم لوگوں نے ساتھ ہی ''سیفیہ گرلس کالج'' سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا تھا۔ میں نے بی اے میں داخلہ لے لیا اور ان کی شادی ہوگئی۔

آپ کھڑی کیوں ہیں؟

بیٹھ جایئے!

بیٹھے بیٹھے شرمایئے نہیں۔ سلیم نے مذاق کیا۔

آتش دان قریب کرلیجیے۔ ٹھنڈک زیادہ ہے۔

چائے یا کافی؟

کیا پینا پسند کریں گی؟

آپ جو پلا دیں، آپ کے ہاتھ کی ہر چیز اچھی ہوگی۔ اس نے مذاق کیا۔

میری قسمت

دیکھیے نا۔ اس خوش گوار موسم میں تنہا بیٹھا نیم بستہ ہو رہا ہوں اور بیگم ہسپتال کے نرسنگ ہوم میں آنے والے مہمان کی پیشوائی کی تیاری کر رہی ہیں۔

لیکن...

لیکن کیا؟

یہی کہ آپ فیملی پلاننگ کے اغراض و مقاصد کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور ملک کے معاشی ڈھانچے کو مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے تمام سماجی و معاشی پہلوؤں پر مدلل گفتگو کرتے رہے ہیں۔ مگر...

نہیں! تم نے غلط تاثر لیا۔ یہ میرا پہلا بچہ ہے اور پہلے بچے کی خوشی کسے نہیں ہوتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنی خوشی کے ساتھ بچے کی خوشی، تندرستی اور ترقی کو بھی سامنے رکھنا چاہئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب بچے ایک یا دو، اس سے زیادہ نہ ہوں کیونکہ ملک کی ترقی کے لیے تعداد کی ضرورت نہیں بلکہ صحت مند اور باصلاحیت نسل کی ضرورت ہے تاکہ ملک معاشی، سیاسی اور ذہنی طور پر ترقی کر سکے۔ سائنس وٹکنالوجی کے اس عہد میں اچھے سائنس داں، اچھے ڈاکٹر اور اچھے انجینئر پیدا ہو سکیں اور ملک وقوم کی رگوں میں حرکت و عمل اور دھڑکن پیدا کر سکیں۔ میرا بچہ نہ صرف میرے لیے، میرے خاندان کے لیے بلکہ تمام ملک کے لیے باعث افتخار ثابت ہو۔ کیونکہ بچے قوم کی امانت ہیں اُن کی صحیح تعلیم و تربیت کی ذمہ داری تمام قوم پر عاید ہوتی ہے اور جو قوم اپنے اس احساس ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتی وہ قوم دوسری قوموں کے مقابلے میں پست ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ملک و بھوک و افلاس، بیماری، جنگ وفساد اور انتشار و ابتذال میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہر سچے شہری کا فرض ہوتا ہے کہ ملک کے معاشی نظام کو بہتر بنانے میں بیس نکاتی پروگرام کو بھی مدنظر رکھے اور فیملی پلاننگ کے افادی پہلوؤں کا تمام نسلی و مذہبی تعصب سے قطع نظر مطالعہ کرے اور اس پر سچائی و ایمانداری سے عمل کرے۔ یہی ہماری ترقی کا واحد ذریعہ اور مثبت پہلو ہے۔

ارے ہاں! آپ تو تکلف کر رہی ہیں، کچھ کھایا نہیں، بور ہو گئیں کیا؟ میری اس تقریر سے۔

نہیں۔ ایسا کیوں! بلکہ میں تو فخر و ارتباط محسوس کر رہی ہوں کہ آپ کے دل میں ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا، ہندوستان کی صالح روایات کا اور یہاں کی تہذیبی قدروں کا کتنا زیادہ خیال ہے۔ اس کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ آپ کے دل میں بے پناہ ہے۔ اور آپ —

کیوں تعریف کرتی ہو! میں تو کچھ بھی نہیں، ہاں اپنے کام کو عبادت سمجھ کر کرتا ہوں۔ ہندوستان کی مٹی سے، یہاں کے پھل پھول سے، ندی و پہاڑ سے چرند و پرند سے اور سچے ہندوستانیوں سے پیار کرتا ہوں اور فیملی پلاننگ کے اغراض و مقاصد کی روشنی میں ملک کے معاشی نظام کی درستگی کے لیے بہ تن مصروف رہتا ہوں اور اپنے طور پر زیادہ سے زیادہ کام کرنے کے بعد ذہنی آسودگی اور طمانت کا احساس کرتا ہوں۔

بہر حال...

میں یہ بتا رہا تھا کہ میرے بغل میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ اُن کے ہاں پانچواں بچہ ہونے والا ہے اور وہ حضرت ہیں کہ اس بلا کی سردی میں نینی تال تشریف لے گئے ہیں کس قدر احمق اور نامعقول قسم کا آدمی ہے۔ ہمیشہ معاشی پریشانیوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔ نہ بچوں کی صحت کا خیال اور نہ اُن کی صحیح تعلیم کا۔ صرف لفاظی اور مصنوعی زندگی، بال بال قرض سے گندھے ہوئے لیکن احساس ذمہ داری کی کوئی شئے بھی اس کے پاس نہیں۔ ایک کلرک جس کی معمولی تنخواہ اور اس معمولی تنخواہ میں اتنے سارے ڈھیر سارے بچے — آج ایک بیمار، تو کل دوسرا بیمار۔ بیوی الگ کمزور و بدحال، عجیب زندگی ہے اس شخص کی۔ ہے تو میرا دوست، میری باتیں بھی سنتا ہے اور اقرار بھی کرتا ہے، وعدے بھی کرتا ہے کہ میں اب مزید بچوں سے احتراز کروں گا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے طریقۂ کار کو اپناؤں گا۔ صحت کا خیال رکھوں گا اور ہر ماہ کچھ نہ کچھ مستقبل کے لیے پیسے بینک میں جمع کرتا رہوں گا۔ مگر یہ باتیں آج سے نہیں پچھلے چھ سات سالوں سے کرتا رہا ہے لیکن مزاج کی بے اعتدالی اور ذہنی کمزوری آڑے آتی رہی ہے۔ ایسے لوگوں کے رویے نہ صرف ان کے لیے بلکہ پوری قوم کے لیے ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے...

نشی محو گفتگو تھی اور سلیم صاحب کی لذتِ تقریر سے مسرت کشید کر رہی تھی۔ وہ بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عزم و یقین اور آنے والے کل کی شفق پھیل گئی تھی۔

نشی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

چلئے میں آپ کو اپنی گھوڑا گاڑی پر لے چلوں گا۔ مجھے فارم جانا ہے۔ میں آپ کو راستے میں چھوڑتا جاؤں گا۔ اسپتال راستے ہی میں پڑتا ہے۔ دیکھیے نشی صاحب، نجمہ کو یہ نہ بتایئے گا کہ میں آپ کو یہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ہنکاری دی۔ گھوڑا تارکول کی چکنی سڑک پر تیز دوڑ پڑا تھا۔ ابھی تک درختوں سے اوس کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ ہوا میں تیزی آگئی تھی۔ اُس نے مفلر کو کانوں تک لپیٹ لیا۔

اب وہ تیزی سے پہاڑی ٹیلے پر چڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے کھیتوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ٹیلے پر پہنچ کر اُس نے ایک خوشی کا گہرا کش لیا اور گھوم کر اپنے مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ کھڑکی پر پردہ اُسے نہیں دکھائی دے رہا تھا وہ مسرتوں سے یکسو ہو رہا تھا۔ خوش آئند مستقبل کی تعبیر دیکھ رہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہمالیہ کی طرح اونچا اٹھتا جا رہا ہے اور اس کے پہلو میں دو دوست، ایک اس کی بیوی اور ایک بیٹا فخر وانبساط میں سر اٹھائے ایک نئے ہندوستان کی بنیادوں پر آفتابی شعاؤں کو بوسہ لیتے دیکھ رہے ہیں اور بہت دور عقب میں ایک خوبصورت سی گڑیا پریوں کی آغوش میں مسکرا رہی ہے۔ اس کے ننھے منے ہاتھوں سے نغمے پھوٹ رہے ہیں اور پتلے پتلے ہونٹوں پر شبنمی خوشبو رقص کر رہی ہے۔ اور وہ خوش رنگ پھولوں سے لدے کھیت کی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا ریستوران کی طرف چل رہا تھا جو اُس کے کھیت سے آدھے فرلانگ پر تھا۔

———— ۱۹۷۶ء

شامِ غم کے بعد...

کار اس کے قریب سے تیزی سے گزر گئی

وہ لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے بچا

وہ ایک لمحہ رُکا اور اس وقت تک رُکا جب تک کار دوسری موڑ تک نہیں پہنچ گئی

اُس نے ایک سسکی لی

اور گھر کے راستہ پر ہولیا۔

بیٹے کہاں رہ گئے تھے۔ کہیں نہیں ماں۔ آج کام زیادہ تھا ماں۔ ماں میں کتنا بدنصیب ہوں۔ مجھے پیدا ہوتے ہی مار کیوں نہیں ڈالا۔ وہ ماں کی آغوش میں پڑا سسکیاں لیتا رہا۔

دور نجمہ ان سسکیوں میں راہِ نجات ڈھونڈتی رہی۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کاش بھائی کو اتنی زحمت نہ اُٹھانی پڑتی۔ میں بارہوں ان پر۔ میرے وجود نے اُن کی فکروں کو اور گراں بار کر دیا ہے۔

نجمہ تم کیوں اداس ہو۔ جب تک تیرا بھائی زندہ ہے تیرے لیے زندہ رہے گا۔ اُس نے اُس کے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے کہا اور پھر ہنستے ہوئے بولا۔ نجمہ تم اداس ہوجاتی ہو تو میرا عزم بھی متزلزل ہونے

لگتا ہے۔تم میری عزت ہو۔ گھر کی آبرو ہو۔ میں اس کی حفاظت کروں گا۔ میں تمہیں وہ پیار دینے کی کوشش کروں گا جو ایک بھائی کو دینا چاہیے۔

چلئے کھانا کھالیجیے۔

نجمہ تم کتنی اچھی ہو۔ کتنا اپنے بھائی کا خیال کرتی ہو۔ اگر مجھے تمہارا پیار، ماں کی محبت نہ ملتی تو میں کب کا کفن پہن چکا ہوتا۔ تمہارے اس پیار پن نے مجھے زندہ رہنے کا حوصلہ بخشا ہے۔ تمہارے ہاتھ کی بنی ان روٹیوں میں کتنی لذت ہے۔ بہت اچھا بناتی ہو۔ جس گھر جاؤ گی اُسے جنت بنادو گی۔ تمہاری مسکراہٹ، تمہارا خلوص نئے گھر کے لیے پیغام حیات ثابت ہوگا۔

نجمہ شرما کر بھاگی۔ بھائی نے چوٹی پکڑ کر کھینچا وہ گرتے گرتے بچی۔ پگلی کہیں کی۔ سسرال کے نام سے شرماتی ہے۔ وہی تو تیرا اصلی گھر ہے۔ وہی تو تیری تمناؤں کا مرکز ہے۔ وہی تیرا ملجیٰ و ماویٰ ہے۔

پھر وہ اداس ہوگیا— کاش نجمہ میں تیرے ہاتھ جلد سے جلد پیلے کردیتا۔ اُس نے دل میں سوچا۔ خدا جانے کب اس دروازے پر بابل کے گیت گائے جائیں گے۔ کب میری بہن دلہن بن کر اس گھر سے خوش خوش رخصت ہوگی۔

رات زیادہ گزر چکی تھی۔ بستر کی ہر شکن انگارے بن گئے تھے۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا اور روشن مستقبل کی طرف بڑی پُر امید نظروں سے دیکھتا رہا۔

ایک دن وہ اسٹاف کلب کے مشاعرے میں ملی۔

وہ خوبصورت تھی۔ حسین اور جامہ زیب— لیکن— اُس نے سوچا— ذہن کو ایک جھٹکے سے آزاد کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

وہ اس کے قریب آئی— بڑی اچھی غزل سنائی آپ نے۔ مبارک باد قبول کریں—

شکریہ— لیکن میری شاعری تمہیں کیوں پسند آئی۔ جبکہ میری شاعری میں سوائے درد و مایوسی کے رکھا ہی کیا ہے۔

یہی تو شاعری کی روح ہے۔ جو انسان کو متاثر کرتی ہے۔ جذبہ خلوص، دردمندی اور دوستی کے احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ روح اگر شعر میں موجود نہ ہوگی تو باوجود تمام خوبیوں کے شعر ایک پیکر، بے جان روح ہوگا۔ ایک پھول بے رنگ و بو رہے گا۔ خیال کی سچائی دردمندی کی آمیزش سے پُر اثر ہوجاتی ہے۔ آپ اس پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ اسی لیے آپ کے شعر مجھے پسند ہی نہیں عزیز تر بھی ہیں۔ کیا آپ اس

سے منکر ہیں؟

اُس نے سوال کیا۔

نہیں۔۔۔

تو پھر۔۔۔؟

کچھ نہیں۔۔۔ اس نے حلیمی سے کہا۔

وہ اس کے قریب آئی۔

جلیس نے خاموشی سے دیکھا۔۔۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بیٹھئے!

آپ کی شخصیت میں جو در پردہ درد کی شدت ہے اُسے میں محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔۔۔ اُس نے کہا۔

آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں؟

ایک شاعر زیادہ حساس ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ حوادثاتِ زمانہ سے بہت جلد متاثر ہوجاتا ہے۔ اس کا یہ غم انفرادی بھی ہوسکتا ہے اور اجتماعی بھی۔۔۔ جلیس نے غم کی تشریح کرنے کی کوشش کی۔

نہیں!۔۔۔

آپ کچھ چھپانا چاہتے ہیں۔۔۔ اُس نے بحث کرنی چاہی۔

آپ سے کیا چھپاؤں گا۔۔۔ اُس نے کہا۔

آپ کیوں فکر کرتی ہیں میرے لیے۔۔۔ ایک اجنبی کے لیے۔۔۔

میں آپ کو ایک ازل سے جانتی ہوں جلیس صاحب۔ آپ ادھر ان آنکھوں میں دیکھیں۔۔۔ پڑھیے۔۔۔ کیا میں آپ کے لیے اجنبی ہوں۔۔۔

وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

آپ کیوں آنسو بہاتی ہیں میرے لیے۔۔۔

ایک غریب صحافی کے لیے۔۔۔ اُس نے تیکھے لہجہ میں کہا۔

آپ کیوں مجھے اور رُلانا چاہتی ہیں جائیے۔۔۔ خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیجیے۔ مجھ غریب صحافی کو تو محبت بھی کرنی نہیں آتی۔ یہ حق تو صرف دولت مندوں کو حاصل ہے۔ جہاں محبت بھی ترازو پر

تولی جاتی ہے۔ ہم تو صرف بھوک اور افلاس سے محبت کرتے ہیں۔ انگاروں سے محبت کرتے ہیں جو درد کی شدت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔۔

میری نظموں میں جو رومانی کیفیت نظر آتی ہے وہ صرف دھوکا ہے — فراڈ ہے — شاید — کس کے لیے — آپ کیوں اداس ہوگئیں۔

آپ کو میرے پاس سوائے آنسوؤں کی قندیلوں کے اور کیا ملے گا انجم صاحبہ — انجم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا — جلیس صاحب آپ بے حد خفا ہیں — مجھ سے یا زمانہ سے — مجھے کس گناہوں کی سزا دے رہے ہیں آپ — آپ غم کی شدت کو اتنا کیوں محسوس کرتے ہیں۔ غم بیماری ہے جو آپ کو جلا کر خاک کردے گی۔ آپ کو ہر روشنی بھی فراڈ نظر آتی ہے۔ ہر غلطی، ہر بھول کا اعتراف بھی آپ کی نظر میں دھوکا ہے۔ فریب ہے — کاش آپ زندگی کے اس پہلو پر بھی غور کرتے جہاں مجبوری و بے چارگی کی آہنی دیواریں بھی ہیں۔ جہاں روشنی سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے۔ کاش آپ نے زندگی کے اس رُخ کو بھی دیکھا ہوتا جہاں اُمید ہے اور شبنمی ٹھنڈک بھی۔

آپ کیوں جذباتی ہوگئیں — آپ کی نظر میں غم کی کیا قیمت — غم تو ہمارے حصہ میں آیا ہے۔ ہم نے جب بھی خوشیاں چاہیں، وقت کے ناگ نے آکر ڈس لیا — میری خوشیاں — یہ لمحاتی خوشیاں کب راس آئی ہیں۔ یہ ابتدا ہے اس غم کی جہاں مایوسی، بے چارگی اور آزردگی کے خارزار کانٹے ہیں —

بہت خوب — آپ ابھی تک فلسفۂ غم کی گتھیاں سلجھا رہے ہیں اور دنیا کہاں سے کہاں جارہی ہے۔ عزم و حوصلہ اور امید کا دامن تھامیے، خوشی آپ کے قدموں پر ہوگی۔ جلیس صاحب — وہ گویا ہوئی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ہلکا سا اشارہ تھا۔ کب ٹوٹیں کب بکھریں —

آپ کی یہ دردمندی مجھے بھی نہ بخشے گی۔ آیئے باہر لان پر چلیں —

جلیس کے لیے یہ رات بڑی گراں بار اور محرومیوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ چاند ستاروں کی دنیا اس کے لیے تازیانہ بن گئی تھی۔ یہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی ہوائیں زہر آلود ہوگئی تھیں۔ رات کی بے چینی اس کی پیشانی سے ظاہر تھی —

شکست خوردہ آوازیں اس سے کہہ رہی تھیں۔

بھاگ جاؤ — خوشبوئیں یکجا نہیں ہوسکتی۔ نغمہ حیات کا اسیر کرنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔

چاندنی، کیف، خوشی، تمہارے لیے نہیں —

یہ لمحاتی خوشیاں دیر پا نہیں۔

وہ خوفزدہ آنکھوں سے زندگی کے نشیب و فراز میں جانے کیا تلاش کرتا رہا۔

رات سیاہ ہو چکی تھی—

وہ انجم سے مل کر اور شکستہ و مجروح ہو گیا تھا۔

الجھنیں شدید تر ہوتی گئیں— اب اس کی یہ حالت تھی جیسے کوئی کچی نیند سے جاگ اُٹھے۔ آنکھوں میں جلن، سرخ ڈورے، دل کے ہر گوشہ میں ایک بوجھل سناٹا۔ جذبات کی شدت اس کا سارا بدن کرب و بے چینی میں جل رہا تھا۔

وہ نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔

جس کی زندگی میں کوئی مضراب نہیں۔ ایک ایسا ساز جو بنتا ہے اور بگڑ جاتا ہے— سکون دائمی نہیں۔ شاہراہِ حیات پر کوئی خوشبو نہیں— کوئی نغمہ نہیں—

مگر—

تم اسے بھول کیوں نہیں جاتے۔ زندگی کا ایک نصب العین بھی ہے— سب بھول جاؤ— سنیما کی جیتی جاگتی تصویروں کی طرح—

ماں—

بیٹے تمہیں نجمہ کی بھی کوئی فکر ہے۔ بیٹا اسلم اگر نجمہ کو قبول کر لے تو—

ماں—

ایسا نہ سوچو— ماں تم نے فیصلہ صحیح نہیں کیا ہے۔ وہ امیر باپ کا بیٹا اُسے یہاں کیا ملے گا۔ نجمہ اس کے لیے بار بن جائے مجھے پسند نہیں۔ وہ اس کے گھر کا کیسے جزو بن سکتی ہے۔ میں اتنا خودغرض نہیں۔ وہ غریب ہے اور غریب کے گھر ہی خوش رہ سکے گی—

نجمہ نے ان کی سرگوشیاں سنی— دو بوندیں آنسوؤں کی لرزیں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اسلم کی نہیں ہو سکے گی۔ اس کی سسکیاں ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئیں۔

اس نے بھی اسلم کو چاہا تھا۔ ٹوٹ کر چاہا تھا۔ من ہی من چاہا تھا لیکن بھائی کے مبہم فیصلہ کو سن نہیں سکی۔ اس کے لیے یہ حادثہ ناقابلِ برداشت تھا— ایک تلخی— ایک گھٹن—

اس نے لرزاں لرزاں خلا کی جانب دیکھا اور پھوٹ کر رو پڑی۔ یہ رات نجمہ کے لیے بڑی

گراں بارتھی، تمنائیں روٹھ گئی تھیں۔ آرزوؤں کا پرندہ کہیں اڑ گیا تھا۔ محرومی، ناکامی کا احساس دوچند ہو گیا تھا لیکن ـــ

اسلم کو یہ خبر ملی تو وہ نجمہ کی خوشیوں کے لیے، اس کی تمناؤں کے لیے تیار ہو گیا۔

نجمہ یہ خوشی برداشت نہ کر سکی۔ اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں اُس نے سوچا ـــ ایک سجا ہوا کمرہ ہے پھولوں کی مسہری بچھی ہوئی ہے۔ ریشمی کپڑوں میں لپٹی لپٹائی شرمائی سی ـــ اسلم گھونگھٹ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ سمٹی جاتی ہے ـــ اس نے آنکھوں میں دیکھا ـــ جہاں انگنت چراغ جگمگا رہے تھے ـــ

بارات کچھ گھنٹے بعد آنے ہی والی تھی۔ دروازے کے بارے شہنائی گونج رہی تھی ـــ اور اب تو بارات بھی آ چکی تھی ـــ وہ لوگ ''مدینہ مینشن'' تک آ پہنچے تھے۔ بینڈ کی زوردار آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بارات کے استقبال کے لیے سارے مہمان اور دور سے آئے ہوئے لوگ باہر مجتمع ہو رہے تھے۔

ہر لمحہ ـــ ہر آن بارات دروازہ تک پہنچنے والی تھی ـــ دوسری منزل پر بے شمار لڑکیاں اور عورتیں بارات کو دیکھنے کے شوق میں جمع ہو گئی تھیں اور پھر ـــ

نجمہ رخصت ہو گئی ہے ـــ باغ کی بلبلیں اڑ گئیں ـــ گھر کا ہر گوشہ نغموں سے خالی ہو گیا ـــ

جلیس ـــ انجم کی االواز آئی۔

انجم ـــ

ہاں چلیں ـــ

وہ تنہا خالی خالی نظروں سے نجمہ کے اس کمرے کو دیکھ رہا تھا جو اب سونا تھا۔ ہر سو سناٹا ـــ کوئی نغمہ ـــ کوئی خوشبو ـــ نہیں ـــ خوشبوئیں اڑ گئی تھیں۔

انجم ـــ میں نے تمہیں ماضی کے دریچوں سے دیکھا تھا۔ کون تھا جس نے مجھے فریب نہیں دیا۔ حادثہ جو قدم قدم پر چوٹ دیتا رہا ہے۔ انجم میں نے ہر خوشی کا گلا گھونٹنا چاہا تھا۔ اب تو میں ہر انجانے خوف سے کانپ جاتا ہوں ـــ جب میں نے روشنی چاہی تیرگی ملی ـــ جب پھولوں کی تمنا کی، کانٹوں نے دامن تھا لیا ـــ ہر خوشی کہانی بن کر داد طلب نظروں سے دیکھتی رہی ـــ انجم رو پڑی۔ اس کی آنکھیں ساون کی گھٹا بن کر برسیں۔ وہ بولی ـــ تم بہت خفا ہو مجھ سے۔ تم مجھے جتنا چاہو سنا لو۔ میں کب برا مانوں گی۔ میں بے وفا تھی۔ میں نے تمہیں آنسوؤں کے تحفے ہی دیے۔ ایک ایسا زخم جو ہمیشہ رستا رہے ـــ

جلیس ـــ میرے جلیس ـــ میں نے تمہاری محبت کی قدر نہیں کی ـــ

لیکن — جب میں نے تم سے پہلی محبت کی دہائی دی تو تم نے اپنا دامن کھینچ لیا — میں یقیناً ذمہ دار ہوں اس ناکامی، اس نامرادی اور اس مایوسی کی۔ مجھے تم سے معافی مانگنی چاہیے تھی۔ میں اس وقت خوابوں میں بہہ گئی تھی۔ میں نے خشک ندی کو خوش رو چشمہ جانا تھا۔ میں دنیاوی چمک دمک پر ریجھ گئی تھی۔ میں نے تمہیں بھلا دیا اور پھر اس بھلانے کی سزا بھی پالی —

میں نے تمہیں بے چینی اور کرب بخشا ہے۔ میں اب اُسے واپس لینے آئی ہوں۔ تم اپنے دکھ مجھے دے دو — میں اس درد کو سینے سے لگا کر رکھوں گی —

میرے جلیس تم مجھے معاف کر دو —

میں نے تمہیں خوشی دے کر خوشی چھین لی تھی۔ میں نے تمہیں راستہ دکھا کر کہیں اور بھٹک گئی تھی۔

تم کبھی کہا کرتے تھے — میں تمام عمر تمہاری سیاہ آنکھوں میں بہار کی اُمڈی گھٹائیں دیکھوں گا —

تم میرے لیے گل رعنا ہو، شبنم ہو، ناہید ہو، جوہی کے گجروں میں لپٹی ہوئی دلہن ہو —

جلیس نے نم دیدہ آنکھوں سے دیکھا۔

آوازیں — ابھریں — اور ابھرتی گئیں — اس نے اپنی زندگی میں یہ پہلی رات سکون سے کاٹی تھی۔ ایسی رات جس میں محبوب کا حسین خیال ہوتا ہے۔ زندگی کی رعنائیاں ایسی رعنائیاں جس میں البیلے خوابوں کی گنگناہٹیں ہوتی ہیں۔ ایک نئی زندگی کے مہکتے نشان ہوتے ہیں۔ وہ منزل جس کے لیے چاند نغمات بنا کرتا ہے۔ نسیم آوارہ پھرا کرتی ہے۔

دیکھو —

چاند ستارے رقصاں ہیں، ہم بھی رقص کریں، گیت گائیں —

دونوں سرگوشیوں میں منہمک تھے — اُس نے انجم کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کے خاموش چہرے کو ایک عجیب چاہت سے دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں شہنائی بج رہی تھی۔ چاند آسمان پر آہستہ خرامی سے منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چاند سہاگن کی طرح لرزاں تھا۔ صبح کے آثار ہویدا ہو چلے تھے۔ تارے آخری بار آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ گلاب کی پتیاں دلہن کی مانند سرخ چولا پہنے شاخوں پر کانپ رہی تھیں۔ نسیم سحر گنگنانے لگی تھی — ان کی محبت تابندہ ہو گئی تھی —

———— ۱۹۷۴ء

زخم دل

عاصمہ، جاوید کو جاتے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک کہ تانگہ اسے دکھائی دیتا رہا۔ ان کے چہرے پر خوشی اور غم کی اختراعی کیفیت مترشح تھی۔ اس نے اپنے جینے کے لیے کتنے حسین خواب دیکھے تھے لیکن ولید کی اچانک ایک حادثہ میں انتقال ہوجانے کی وجہ سے اس کے تمام خواب بکھر گئے تھے۔ اس کی آرزوؤں کا شیش محل گر کر چکنا چور ہوگیا تھا جس کی کرچیں چنتے چنتے اس کی انگلیاں زخمی ہوگئی تھیں۔ لیکن اُس نے ننھے جاوید کے مستقبل کے لیے اپنی بقیہ زندگی بیوگی میں گزار دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

نہ جانے کیوں آج اُسے اپنا بچپن یاد آرہا تھا جب وہ ایک ننھی بچی تھی اور اس کا ہم عمر جاوید دونوں ساتھ اسکول پڑھنے جاتے تھے۔ بچپن کی دوستی جب جوانی کے حدود میں داخل ہوئی تو جاوید اس سے علیحدہ ہوگیا۔ اس کی اس علیحدگی نے اسے ایک طرح کی خلش بخشی تھی لیکن حالات سے اسے ولید کا جیون ساتھی بنادیا۔

لیکن یہ رفاقت بھی زیادہ دن راس نہ آئی۔ چار سال بعد ولید بھی اسے تنہا چھوڑ گیا— اور اب وہ اس تنہائی کے صحرا میں ایک بے بس پرندے کی طرح العطش پکار رہی تھی۔ اس کے سارے احساسات اور تمام تر جذبات ریت کے گھروندے کی طرح مسمار ہوگئے تھے اور اس کی انگلیاں اس ٹوٹے کھنڈر میں

ماضی کی حسین یادوں کے نقوش تلاش کر رہی تھیں۔

لیکن کب تک وہ مایوسیوں اور نامرادیوں کے جنگل میں یوں بھٹکتی پھرتی، اسے کوئی جائے پناہ تو تلاش کرنی ہی تھی۔ اس نے پرائیویٹ طور پر بی اے کی تیاری شروع کردی اور علی گڑھ سے اُس نے بی ایڈ بھی کرلیا۔ اس طرح اس نے اپنی نامراد زندگی کے تین سال کتابوں کے اوراق الٹنے میں صرف کردیے۔ اسے ایک طرح کی آسودگی ملی تھی۔ ایک طرح کی ذہنی طمانیت حاصل ہوچکی تھی۔

ثابت قدمی اور اولوالعزمی نے اس کی زندگی کے کربناک اور اداس دھارے کا رُخ موڑ دیا تھا۔ کربناکی، اداسی اور نامرادی کے سیاہ دن بھلا دیے تھے۔ اس نے اپنے عزم راسخ سے اپنی راہ کی تمام مشکلات پر فتح پالی تھی۔ اس کی منزل اس کے سامنے تھی۔ اب اس کا جاوید بھی اس کی آرزوؤں کا واحد مرکز تھا۔ وہ اپنے جاوید کو ایک مکمل اور قابل تقلید نوجوان کی شکل میں دیکھنے متمنی تھی۔ اس نے ہر طرح کی تکالیف اُٹھا کر اپنی آرزوؤں کی شادابی کے لیے ایک منزل پالی تھی۔ وہ منزل تھی اس کے عزم وارادے کی اس کی آنکھیں اس خوبصورت جزیرے کو دیکھ سکتی تھیں جہاں خوبصورت گلاب جہاں حسین تتلیاں پھولوں کی آغوش میں رقص کرتی ہیں جہاں آرزوؤں کے خوبصورت پھول کھلتے ہیں——

شام کے پرندے نے اپنے پر کھول دیے تھے۔ جاوید نے کھلے آسمان کی طرف دیکھا کازوں کی ایک لمبی قطار قاں قاں کرتی گزر رہی تھیں اور بادل کے چند ننھے ٹکڑے ہوا میں تیر رہے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے ان بادلوں کے ٹکڑوں کی بنتی بگڑتی تصویروں کو استعجابی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ننھے منھے ہاتھوں سے تالیاں بجا کر گھوڑوں کو دوڑتے، شیر کو ڈکارتے، پرندوں کو اڑتے دیکھتا رہتا۔ ماں اس کی توجہ اپنی طرف موڑتے ہوئی بولی——

بیٹا—— بس کرو، گردن میں درد ہونے لگے گا۔ آؤ میرے پاس میں تمہیں آج ایک ایسی کہانی سناؤں گی جو تم نے کبھی نہ سنی ہوگی۔

وہ ماں کی طرف لپکا ہی تھا کہ ٹھوکر کھائی—— انگوٹھے کا ناخن اکھڑ سا گیا تھا۔ وہ درد سے تلملا اُٹھا۔ ماں کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ دوڑی دوڑی آئی تو ننھا جاوید چیخ رہا تھا۔ تکلیف نے اس کی ساری شوخی، ساری ذہانت ختم کردی تھی۔

ماں نے کہا بیٹے—— دیکھو بیٹے تم نے خود فراموشی میں کتنی تکلیف اُٹھائی۔ اتنا نہیں سوچتے——

ماں—— پھر کب سوچتے ہیں؟

بیٹا— جب تم بڑے ہو جانا خوب سوچنا۔

ماں— تو میں اب کیا کروں۔ بغیر سوچے ہوئے سبق بھی تو یاد نہیں ہوتا۔ ماں میں ان بادلوں کی تصویریں بناؤں گا۔

ہاں ہاں ضرور بنانا۔ ماں نے سمجھایا۔ وہ ماں کی گرم آغوش میں اپنا تمام درد بھول کر سو گیا۔ اس کے چہرے پر تکان کا اور کسی تکلیف کا نشان تک نہ تھا۔ وہ صرف بادلوں کی بنتی بگڑتی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ جیسے ننھے منے بادل کے ٹکڑے اس کے اپنے دوست ہوں۔ اس کے لبوں پر معصوم مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور ماں اس کے جذبوں کو متشکل ہونے کا خواب دیکھ رہی تھی۔

وہ عبداللہ کالج میں اردو ٹیچر تھی۔ اس نے اپنی سادگی اور خلوص کی وجہ سے کالج کی طالبات اور مسٹرس میں ہر دل عزیزی حاصل کی تھی— عبداللہ ہال کے جلسے کی کامیابی کے لیے نت نئی جدتیں کی تھیں۔ ڈرامہ، فینسی شوڈریس، میوزک وغیرہ کے پروگرام کو اس حسن وخوبی سے ترتیب دیا تھا کہ شرکا کے جلسہ نے اس کی اس کامیابی پر دلی مبارکباد دی تھی۔ کالج کی پرنسپل آصفہ خاتون نے جلسۂ تقسیم اسناد میں تقریر کرتے ہوئے عاصمہ کی ادبی اور سوشل دلچسپیوں اور اس کی ذمہ داریوں کی دل کھول کر تعریف کی تھی۔

وہ اپنی تعریف سے محجوب تھی۔ اردو ادب سے دلچسپی اور زندگی کے اس سونے پن نے اسے ایک کامیاب ترین افسانہ نگار بنا دیا تھا۔ اس کے افسانہ ملک کے بیشتر رسائل میں پابندی سے شائع ہوتے اور سینکڑوں تعریفی خطوط اس کے قلم کو نئی طاقت، نئی توانائی بخشتے رہے۔

شمع میں اس کی ایک کہانی پر اُسے ایک ایسا خط ملا تھا کہ اس کی پرسکون زندگی میں ایک بار پھر ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ لکھنے والے نے لکھا تھا—

عاصمہ صاحبہ!

مجھے آپ کی کہانیاں بے حد پسند آتی ہیں۔ آپ کی کہانیاں ہر ٹوٹے دل کے لیے قوتِ شفا ہیں۔ اور یہ حالیہ کہانی ''زخمِ دل'' ایک ایسی لازوال کہانی ہے جو ہمیشہ زندہ جاوید رہے گی۔ میں دل کی عمیق گہرائیوں سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کا قلم اس طرح کی کہانیاں لکھتا رہے— جاوید

عاصمہ نے خط پڑھ کر جاوید کو یاد کیا تھا۔ آج سے پندرہ سال پہلے کا ساتھی اور غم گسار—

——————۱۹۷۰ء

خوبصورت موڑ

الٰہ آباد

۱۰ر اگست ۱۹۷۱ء

بھابھی صاحبہ۔ تسلیم!

بھلا میری کیا مجال جو آپ کی مخالفت کروں۔ آپ کے خط کو کئی بار پڑھ چکا ہوں جس میں میری موت و زندگی کا سوال درپیش ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اس قسم کے معاملوں میں حصہ کیوں لیتی ہیں۔ خاندان میں بہت سی شادیاں آپ ہی کی ایما پر ہوئیں اور اب میرا بھی نمبر آ گیا ہے۔

اگر ناگوار خاطر نہ گزرے تو کچھ عرض کروں جس سے آپ یہ اندازہ لگائیں کہ شوکت کیا چاہتا ہے اور اس کا کیا خیال ہے۔ میرا خط جسے آپ گستاخی تصور کریں گی، پھر بھی اگر آپ میرے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کریں تو مہربانی ہوگی۔

روزانہ صبح میں کمپنی باغ جاتا ہوں۔ یقین مانیے اگر اس پارک میں ۶۰ فیصدی مرد آتے ہیں تو ۴۰ فیصدی عورتیں ضرور آتی ہیں۔ پھر غضب یہ کہ مردوں ہی کے سامنے ورزش کرتی ہیں۔ شام ہوئی نہیں کہ تفریح کرنے گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور لباس کو اس خوبی سے عمل میں لاتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔

ساتھ ہی ساتھ — ہونٹوں پہ لالی، گالوں پر سرخی اور چہرے پر پاؤڈر کا استعمال لازمی جزو ہے۔ خوبی یہ ہے کہ سنیما، کلب اور دیگر دلچسپیوں کی جگہ اُن سے خالی نہیں جاتی۔ اس پہ کمال یہ ہے کہ "خاتون مشرق" کہلانے کا دعویٰ کرتی ہیں۔

بھابھی صاحبہ! آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ایک گاؤں کی لڑکی کے کیا کیا اطوار ہیں۔ بے چاری صبح سے لے کر شام تک گھر کے کاموں میں مصروف رہتی ہے۔ اب آپ خود انصاف کیجیے کہ مشرقی خاتون کہلانے کی کون مستحق ہے — یہ گاؤں کی نیک، شرمیلی لڑکیاں یا شہر میں لڑکوں کے دوش بہ دوش اُٹھنے بیٹھنے والی، ہیروئن جیسی ایکٹنگ کرنے والی، کلبوں میں ڈانس کرنے والی لڑکیاں — یہ لڑکیاں جو مذہبی رسالوں کی جگہ فلمی رسالے، رومانی ناولیں پڑھتی ہیں اور گلے میں دوپٹہ کا مفلر ڈال کر بے کار سڑکوں پر گھوما کرتی ہیں — بات بات پر قہقہہ لگاتی ہیں اور مصنوعی چیخیں مارنا انہیں خوب آتا ہے۔

بھابھی صاحبہ! جب اُن کی مائیں ہی فیشن پرستی کا شکار ہیں تو انہیں کی دیکھا دیکھی آنے والی نسلیں انہی کے نقش قدم پر چلنے لگیں گی — نتیجہ — لازمی طور پر بُرا ہی ہوگا۔ پھر آپ مجھ سے کہتی ہیں کہ "پروین" سے شادی کی رضامندی دے دوں۔ اب آپ ہی بتلائیے یہ سب دیکھتے ہوئے میں کیا جواب دوں۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ میرے حال پر مجھے چھوڑ دیں اور اگر آپ کا یہی اصرار ہے تو میرا ہم خیال تلاش کر دیجیے۔

آپ کا خادم

شوکت

الٰہ آباد

۱۰ را گست ۱۹۷۱ء

میری اچھی آنٹی

آداب!

آپ کا خط ملا۔ جواب میں یقیناً دیر ہوئی جس کی معافی چاہتی ہوں۔ میں گھر پر موجود نہیں تھی۔ میں اس درمیان لکھنؤ، آگرہ، علی گڑھ اور دہلی اپنے دوستوں کے ساتھ ٹور پر تھی۔

آپ نے میری شادی کی رضامندی چاہی ہے۔ مگر آپ جانتی ہیں کہ میرا ارادہ فلاسفی میں ایم اے کرنے کا ہے اور ابھی میں اس کا خیال بھی نہیں کرتی۔ اور پھر شوکت صاحب ایسی لڑکی چاہتے ہیں جو بے چاری صبح سے لے کر رات تک گھر کا سارا کام کرے۔ جس میں صفائی کرنا، تمام گھر کا کھانا پکانا، بچوں

کے کپڑے دھونا، سلائی کرنا وغیرہ شامل ہے۔ ظاہر ہے میں یہ کام نہیں کرسکتی اور آپ جانتی ہیں کہ میری ممی مجھے گھر کا کوئی کام نہیں کرنے دیتیں۔ پھر بھلا میں یہ سب کام کیسے کرسکتی ہوں۔ اُن کے لیے تو کوئی نکھٹو لڑکی چاہیے۔ جو ہاتھ بھر کا گھونگھٹ نکالے ساس سسر کی جا بے جا ہر بات کا خیر مقدم کرے ـــ

اچھا اب اجازت دیجیے۔ ابھی مجھے ۱۵ر اگست کے سلسلے میں ایک ڈرامہ کی ریہرسل کرنے کے لیے جانا ہے۔ زیادہ آداب ـــ

آپ کی

پروین

کانپور

۱۶ر اگست ۱۹۷۱ء

عزیزی شوکت، دعائیں!

خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔ تمہارا خط عین انتظار میں ملا۔ تم نے جو کچھ اپنے اس خط میں لکھا ہے، اُسے پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ جو کہ صرف تمہارے بھولپن کا مبین ثبوت ہے۔ تم نے آئینہ کے دونوں رخ نہیں دیکھے، ورنہ یا تو تم اس قسم کا خط ہی نہ لکھتے یا دوسرے رخ کا اظہار بھی کرتے۔ ہاں میاں شوکت تم نے کبھی اس بات پر غور بھی کیا ہے کہ جو کچھ تم نے دیکھا یا دیکھ رہے ہو وہ کس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ میرے خیال میں تم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا۔ اگر مرد عورتوں کو اُن کے جائز حقوق دینے میں فراخ دلی دکھاتے، اُن کے ساتھ بھیڑ بکریوں کا سا برتاؤ نہ کرتے تو پھر یہ صورت ہی پیدا نہ ہوتی جس کا رونا رویا جارہا ہے۔ کیا عورتیں صرف چہار دیواری کے اندر بند رکھ کر کھانا پکائیں، بچوں کی پرورش کریں اور بس، اُن کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ اگر عورتوں کو اُن کے جائز حقوق دیے جاتے تو یہ عورتیں اس قسم کی دلچسپیوں میں حصہ نہ لیتیں بلکہ شوہر کے شانہ بشانہ بھارتیہ ناری کی لاج لجا رکھتے ہوئے کاروانِ زندگی کو آگے بڑھاتیں۔

دیہات کے بارے میں تم نے قریب قریب ٹھیک ہی کہا ہے مگر ایک بات میرے سمجھ میں نہیں آتی جیسا کہ تم نے اپنے گذشتہ خط میں تحریر کیا ہے کہ گھر کا سارا کام غریب لڑکیوں کے سپرد کیا جاتا ہے اور پھر اُن کو تعلیم سے بھی بے بہرہ رکھا جاتا ہے۔ تعلیم کا یہ مقصد نہیں کہ اُن سے لڑکیاں آزاد ہو جائیں گی اور ماں باپ کی وقعت ان کے دلوں میں نہیں رہے گی۔

میاں شوکت جس طرح جسم کی نشو نما کے لیے غذا ضروری ہے اسی طرح خیالات کی پاکیزگی کے لیے تعلیم۔ مگر میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ تم پڑھے لکھے ہو کر بھی اتنے دقیانوسی خیالات رکھتے ہو— پروینؔ میں آخر کیا برائی ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ سوسائٹی یافتہ ہے اگر امور خانہ کا تجربہ نہیں تو کوئی حرج نہیں۔ اس کمی کو ''ماما'' پوری کردے گی۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے فیصلہ پر دوبارہ نظر ثانی کروگے۔

تمہاری بھابھی

الٰہ آباد

۲۰ر ستمبر ۱۹۷۴ء

میری دلنواز سہیلی، خوش رہو!

تمہارے خط کا جواب کئی دنوں بعد دے رہی ہوں۔ ان دنوں میں کالج کی چیرٹی شو میں مشغول تھی۔ ہاں تو تم نے شوکت صاحب، کے بارے میں لکھا ہے کہ میں ان میں دلچسپی لے رہی ہوں، تو تمہیں یہ غلط فہمی ہوئی ہے رابعہؔ۔ میں اتنی کوڑھ مغز نہیں کہ شوکت میں دلچسپی لیتی۔ ہاں اگر تم نے جلیس کے متعلق لکھا ہوتا تو میں یقیناً خوش ہوتی کیونکہ وہ ایک ذہین اور نئی پود کا ہونہار ادیب اور شاعر ہے جو میری تعریف میں ہزار شعر کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جس نے اپنی ذہانت سے میرے دل کو موہ لیا ہے۔

ہاں ویسے تو شوکت میں کوئی خرابی نہیں، وہ خوبصورت ہیں، تعلیم یافتہ ہیں مگر اس کے باوجود میں انہیں پسند نہیں کرتی۔ میں آزاد ہوں اور آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ میں اس شخص کی شریک حیات بننا پسند کروں گی جو خود بھی سوشل ہو اور عورتوں کی آزادی کا پورا پورا تحفظ کرنے کا عہد کرتا ہو۔

اچھا یہ بتاؤ سنا ہے کہ تم نے کسی پروفیسر پر ڈورے ڈال رکھے ہیں۔ بڑی خوش قسمت ہو تم رابعہ۔ دیکھو ڈور ڈھیلی نہ ہونی چاہیے، نہیں تو پنچھی پر تول کر اڑ جائے گا اور تم یونہی دیکھتی رہ جاؤ گی۔ اچھا اب اجازت دو— پھر ملیں گے۔

پیار کے ساتھ

تمہاری پروین

رانچی

۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۴ء

مکرمی جمال صاحب السلام علیکم!

امید کہ آپ کی طبیعت اچھی ہوگی۔ یہ معلوم ہو کر نہایت خوشی ہوئی کہ میاں شوکت لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہو گئے ہیں۔ میری طرف سے اس موقعہ پر مبارکباد قبول کیجیے۔ میں آپ سے خود ملنے الہ آباد آتا مگر ان دنوں اتنا مصروف ہوں کہ سوائے چند گھنٹے آرام کے بقیہ گھنٹہ کام ہی میں لگا رہتا ہوں۔ سردی ہلکی ہلکی پڑنے لگی ہے اس لیے مچھلی کی مانگ بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ آپ کے لیے کچھ مچھلیاں میاں سلطانؔ کے ہاتھ روانہ کر رہا ہوں۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور لکھیں۔

نیاز مند

سرفراز حسین

بلند شہر

۱۷/اکتوبر ۱۹۷۱ء

ڈیئر پروین

لرزتے ہونٹوں کا پیام لو

تم نے جو بے پر کی خبر میرے اور جمیل کے متعلق اڑائی ہے وہ سرے سے ہی غلط ہے۔ میں مشرقی تہذیب کی دلدادہ اور وہ مغربی تہذیب کے دیوانے۔ یہ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ مشرق مشرق ہے، مغرب مغرب ہے۔ ان دونوں کا اتصال ممکن نہیں۔

مجھے جمیل صاحب کی ادا ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ میرے چھوٹے بھائی کو پڑھانے آتے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے جاؤ اپنی آپا جان سے میرا سلام کہو اور ''چنگاریاں'' جیسی کہانی لکھنے پر مبارکباد دے آؤ۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر اُن کی اس سادہ لوحی پر ہنسی بھی آئی — اور پھر ایسی آنکھ دکھائی کہ دوبارہ کچھ کہنے سننے کی ہمت نہیں پڑی — اور تم جمیل صاحب کی بات کرتی ہو — جن کو — جانے دو، پھر لکھوں گی۔

تمہاری

رابعہ

بلند شہر

۲۵/نومبر ۱۹۷۱ء

عزیز شوکت

بھئی اب تو پروفیسر ہو گئے ہو۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔ کہو مٹھائی کب تک کھلا رہے ہو۔ سنا ہے کسی پروینؔ نام کی لڑکی سے تمہاری بات چل رہی ہے جو ایم اے کی طالبہ ہے اور وہ بھی فلاسفی سے۔ تمہاری نبھ سکے گی۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ اب تم بھی آزاد خیال ہو گئے ہو۔۔۔

تمہارا

اشرف

الٰہ آباد

۱۵ر دسمبر ۱۹۷۱ء

میری دلربا، رابعہ خوش رہو!

تمہارا دعوت نامہ ملا۔ میں تمہیں اس مبارک بندھن پر ہدیہ مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ خدا سے یہی دعا کرتی ہوں کہ تمہاری اور جمیل کی زندگی ہمیشہ سرسبز اور شاداب رہے، پھلے پھولے اور جس کی دلنواز مہک سے سارا عالم مہک اُٹھے۔۔۔

تمہاری

پروین

بلند شہر

۱۵ر دسمبر ۱۹۷۱ء

میری اچھی پروین!

تمہارا دعوت نامہ ملا۔ مبارک باد قبول کرو۔ میں ضرور اس موقعہ پر حاضر ہوتی مگر مجبور ہوں۔ خدا تمہاری اور شوکت صاحب کی اس نئی زندگی پر بیش بہا رحمتیں نازل فرمائے۔ (آمین)

تمہاری

رابعہ

۱۹۷۴ء ــــــــــــــ

انگلیوں نے آواز دی

خاموشی

آہٹ

جیسے کرسی نے جگہ چھوڑی ہو۔

میں پردے سے اُلجھتے اُلجھتے رہ گیا۔ دو بڑی آنکھیں ۱۱۰ ڈگری کا اینگل بنا رہی تھیں۔ آنکھوں کے درمیان ایک مثلث ٹنگا ہوا تھا جس کا ہر اینگل پ تھا۔

میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر دو آنکھوں کے درمیان ایک اونچی جگہ کو چھونے لگا جیسے ٹٹول کر کسی وجود کو گرفت میں لے لینا چاہتا ہو۔ اس ہری بھری خواہش کے درپردہ ایک بڑی دالان لیٹی ہوئی تھی۔ وہ جس دالان میں ٹھہرا ہوا تھا اس پر کوئی چھت نہ تھی، کوئی دروازہ کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ عقب میں کبوتر نے جھونجھ بنا رکھا تھا۔ اس کبوتر کی باتوں کو بغیر چھت والی دالان نے سنا تو بولی تم کون ہو؟ کس کی تلاش میں نکلے ہو؟

میرا ہاتھ آگے بڑھا اور اس کی زبان پکڑ کر جھول گیا۔ میں تمہاری تصویر لینے آیا ہوں۔ میں

تمہیں اس کیمرے میں قید کر کے بحر ظلمات کی تہہ میں چھوڑ دوں گا تا کہ تم گیلی ہو جاؤ اور تمہاری پیاس بجھ جائے۔

اس نے اس کی باتیں سنی اور دروازے پر قفل ڈال دیا اور کہا اب جاؤ۔ اس دروازے سے گزرو گے تم کو شیشے کا پُل ملے گا۔ اس پار پ ہے جو چاند کے پاس ہے۔ چاند کے پاس کئی ٹیلے ہیں۔ ان ٹیلوں میں غار ہیں اور غار میں حرف کی، لفظ کی دکان ہے جہاں تمہارے مطلب کی ہر چیز ہے۔ مگر ان کو چھو نہیں سکو گے کیونکہ ان کا محافظ چاند ہے۔

چاند کبھی کبھی سورج بن جاتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے ہاتھوں اور ٹیڑھے میڑھے بالوں پر فاختائیں جھونج لگا لیتی ہیں۔ وہ انہیں نہیں چھیڑتا لیکن جب وہ انڈا دے دیتی ہیں تو ان کو سورج کی بھٹی میں پھینک آتا ہے۔ جہاں دو خوبصورت بچے ہیں۔ جن کے پَر سفید ہیں، چونچ کالی ہے۔

میں اس وقفہ میں انگلیوں پر چڑھ جاتا ہوں۔ آنکھوں میں جھک کر دیکھتا ہوں۔ شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اکتاہٹ، جھنجھلاہٹ، کسمساہٹ، تلملاہٹ — ٹ کی تکرار ب سے ٹکراتی ہے تو الف کے بدن سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔ میں پُل سے اُتر کر ایک کمرے میں داخل ہو جاتا ہوں۔ درمیان میں میز ہے جس کے ادھر ادھر صوفہ ہے۔ لال لال کرسیاں ہیں۔ صوفہ پر ب اور پ بیٹھے ہیں، میز پر سفید رنگ کا ایش ٹرے ہے۔ ایش ٹرے لوہے کا ہے۔ ایش ٹرے میں جھانک کر دیکھا تو ایک نوجوان ایک موٹی عورت کے جسم پر نقطے ڈال رہا تھا۔ وہ عورت پرانی ہے۔ نیا لڑکا ہے — میں دونوں کی آنکھوں میں ایک چٹیل میدان دیکھ رہا ہوں۔ جہاں ایک ندی بہنے کے لیے پہاڑوں سے اُترنے کا ارادہ کر رہی ہے۔ چاروں طرف اندھیرے کا حصار ہے جس پر چار مشعل جل رہی ہیں — ب اس کو ہوا دے رہا ہے۔ آگ بھڑکتی ہے اور ایش ٹرے کی دیواروں سے ٹکرا جاتی ہے۔ اس ٹکرانے میں ب کا قہقہہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جگنو قطار در قطار اُڑنے لگتے ہیں۔

میں قہقہہ اور ایش ٹرے کے درمیان ایک سفید پھول کو دیکھ رہا ہوں جس پر کہیں کہیں سیاہ دھبے ہیں۔ وہ لڑکا اس پھول کو بار بار دیکھتا ہے اور گرفت میں لے لینے کی کوشش میں اپنے جسم کو توڑ مروڑ ڈالتا ہے۔

ایش ٹرے کافی گرم ہو گیا ہے۔ میں ب، پ اور اس عورت کے وجود پر غور کرتے کرتے کھڑکی کے پاس چلا گیا ہوں جس میں پانچ لوہے کی سلاخیں اوپر نیچے سے اندر کو دھنسی ہوئی ہیں اور میں ان

سلاخوں سے باہر کود جانا چاہتا ہوں۔ بہت اداس ہو گیا ہوں اور اس اداسی سے کئی چہرے جڑ گئے ہیں۔ ان چہروں میں ب اور پ کے چہرے بھی شامل ہیں۔

میں صوفہ پر بیٹھ جاتا ہوں۔ ایش ٹرے کا مطالعہ شروع کر دیتا ہوں۔ ہر لفظ پڑھنے کے بعد اپنا عمل بار بار دہراتا ہوں۔ میری نگاہیں ۳۲ سال کی پرانی سڑک پر چلی جاتی ہیں۔ جب میں اندھا ہو جاتا ہوں اور انگلیوں کو کتابوں کے صفحات پر دوڑتا محسوس کرتا ہوں۔ جہاں کئی متوازی سڑکیں ہیں۔ کالی لائنیں ہیں جن پر حرف کی، لفظ کی دکانیں ہیں۔ لوگوں کی بھیڑ ہے۔ اس بھیڑ میں میری آنکھیں اک دُکان کی ریک پر چپٹی ہوئی ہیں۔ لوگ اس کے انجام پر رو رہے ہیں۔ لڑکیاں، انگلیوں پر دوپٹہ کا کونہ لپیٹ لپیٹ کر افسوس کر رہی ہیں۔

میں ایک لفظ بن گیا ہوں اور ان دو آنکھوں کے بیچ جا کر لٹک گیا ہوں۔

ابھی تک ب اور پ کا پتہ نہیں۔ الف موجود ہے ب اور پ شاید اپنے نقطوں کی تلاش میں گم ہے جن کو میں نے چھپا کر یا چرا کر، ان دو آنکھوں کے درمیان ٹانک دیا ہے۔

اخبار ابھی تک نہیں آیا ہے۔ چائے کی پیالی میں مکھی تیرنے لگی ہے۔ کھڑکی کا پردہ اُڑنے لگا ہے۔ ہر شئے فعل و اعمال پر آمادہ ہونے لگی ہے۔

اس کے پیروں کے نیچے ایک کالی اور کئی میل لمبی سڑک آ گئی ہے جس پر پانی بہہ رہا ہے۔ انگلیوں نے کنکروں اور پتھروں کو چن کر ایک موزوں مقام پر اکٹھا کر دیا ہے اور ایش ٹرے کو پانی میں پھینک دیا ہے۔ چائے کی پیالی اُلٹ دی ہے۔ مکھی پیروں سے لپٹ گئی ہے۔ ٹانگیں پانی میں ہلا کر بہا دی ہے۔ بسکٹ کی پلیٹ گر کر ٹوٹ گئی ہے۔

اخبار بھونکنے لگے ہیں
کتابیں چیخنے لگی ہیں
رسائل بولنے لگے ہیں

اور میں کمرے کے ساتھ باہر آ گیا ہوں۔ پ نے کمرہ ایک طرف جھکا دیا ہے۔ ب دروازے پر ہی رُک گیا ہے۔ الف ساتھ ہو لیا ہے۔ انگلیاں پسینہ پسینہ ہو گئی ہیں۔ الف، پ کے ساتھ مثلث پر جھول گیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں —— دیکھ رہا ہوں —— دیکھ رہا ہوں ——

———— ۱۹۷۴ء

دریچہ

اس نے دریچہ وا کیا— سامنے کے فلیٹ میں ہلکی نیلگوں روشنی نیچے لہراتی کالی سڑک کے سینے پر پھیل رہی تھی۔ اس کے عقب میں پہاڑی ڈھلانوں پر رات ملگجی لباس اوڑھے دھیرے دھیرے اُتر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ویرانیوں کا بسرا تھا۔ اس کے احساس پر سیاہ رات کی دھند لہرانے لگی تھی اس نے آہستہ سے ادھ جلی سگریٹ ہوا میں اچھال دی۔ جھلمل کرتی چنگاریاں ستاروں کی طرح چمکیں— اور پھر اس نے ایک کرب کے ساتھ اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا—

کل تک موسم انتہائی خوش گوار تھا۔ بادلوں کے ننھے ننھے ٹکڑے ہوا میں تیر رہے تھے۔ ہوا میں گلاب کی خوشبو رچی بسی تھی۔ ہر سمت ایک خوابناک ماحول کی حکمرانی تھی۔

وہ دنیا وما فیہا سے بے خبر مال روڈ سے گزرتے ہوئے پہاڑی ڈھال پر آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت ہاتھ تھا۔ اس کی آنکھیں جادوگری پر مائل تھیں۔ وہ اس کی لہراتی ہوئی زلفوں کی طرف دیکھنے لگا جو گرتے گرتے رُخ سے چل کر ٹھوڑی کے ایک کونے پر آگئی تھیں۔

اور پھر وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اس کیف و سرور کی محفل میں چلے گئے تھے۔ اس دن اسے عجیب سا کیف حاصل ہو رہا تھا۔ آرکسٹرا نغموں کی بارش کر رہا تھا۔ رقص اپنے شباب پر تھا۔ روشنیاں رنگ

بدلنے لگی تھیں۔ جلیس نے البرٹ کے گرد حلقہ سخت کر دیا تھا اور پھر وہ وہاں سے ہٹ گئے اور ناچتے ناچتے ایک پام کے پیچھے اس نے اپنے لب پیوست کر دیے تھے۔ البرٹ شرما گئی تھی اور پھر آرکسٹرا کے نغمے سسک سسک کر دم توڑنے لگے تھے۔ نغموں کا سحر ٹوٹ چکا تھا۔ وہ باہر آئے کچھ جھینپی جھینپی سی اجنبیت تھی—

رات تاریک اور خنک تھی۔ ستارے آسمان پر مسکرا رہے تھے۔ وہ کلب کے ایک کنج میں بیٹھ گئے۔ اس نے ایک بار چاند کو پھر البرٹ کو بڑے پیار سے دیکھا تھا اور اس کے خاموش چہرے کو ایک عجیب چاہت سے دیکھتا رہا تھا۔ اس نے ان آنکھوں میں جھیل کی نیلاہٹوں کو شام کے سیاہی مائل بھورے رنگ میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے ان رخساروں پر گلاب کی پتیوں کو بکھرتے دیکھا تھا۔ اُن رس بھرے ہونٹوں کے خم دار کناروں پر مسکراہٹ کو رقصاں دیکھا تھا۔

وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا تھا۔ اس کے دل میں شہنائی بج رہی تھی۔ چاند سہاگن کی طرح آسمان پر لرزاں تھا۔ شگفتہ چہرہ چاروں طرف بچھا ہوا تھا۔ بیلے اور چنبیلی کے تروتازہ پھول شرمائے شرمائے سے تھے۔ گلاب کی پتیاں دلہن کی مانند سرخ چولا پہنے شاخوں پر کانپ رہی تھیں۔

وہ البرٹ کے چہرے کو ہاتھوں کے ہالے میں لے کر بغیر پلکیں جھپکائے دیکھتا رہا تھا۔ ان نیلی آنکھوں کی نیلی گہرائیوں میں ڈوبتا اُبھرتا رہا تھا۔

جلیسؔ— وہ چونک گیا تھا۔ خیالات آوارہ بادلوں کی طرح چھٹ گئے تھے۔ اس نے اُسے بغور دیکھا تھا—

کیا دیکھ رہے ہو— گھور گھور کر—

یہی کہ تم چاندنی سے زیادہ نرم اور خوبصورت ہو، اور گلاب سے زیادہ سرخ ہو گئی ہو—

البرٹ نے اپنا چہرہ اپنے دونوں گھٹنوں کے اوپر رکھ لیا تھا، جیسے گلدان کے پھول جھانک رہے ہوں—

اس نے بڑی احتیاط سے اپنی انگلی اس کے گالوں پر رکھتے ہوئے کہا تھا— تم اس چاند سے زیادہ خوبصورت ہو اور یہ رخسار بھی کتنے پیارے ہیں۔

کیونکہ تمہارے دوست کے رخسار ہیں— وہ بھی انگریزی میں بولی تھی۔

دونوں انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے— جلیسؔ نے اسی احتیاط سے اس کے لب کو چھوتے

ہوئے کہا تھا — اس کی نرمی گلاب کی پتیوں سے کہیں زیادہ کیف بخش ہے —

ہاں — وہ مسکرائی تھی — اس لیے کہ یہ تمہارے دوست کے لب ہیں۔ جنہیں چوم کر تم لطف اندوز ہو سکتے ہو — مگر گلاب کی پتیاں ہیں جنہیں چومتے ہوئے تمہارے لبوں میں کانٹے چبھ جائیں گے۔ تمہاری آنکھیں شراب ہو گئی ہیں —

ہاں — جلیس بولا — اس لیے کہ میں شراب کی گود میں ہوں۔ البرٹؔ خاموش رہی اس کی نگاہیں گھاس پر جم گئیں۔ آواز حلق میں تھرتھرا کر ٹوٹ گئی — پلکیں کسی جذبے کے بوجھ تلے جھک گئیں۔

میں تمہارے ہونٹوں کو چوم لوں؟

او — ہوں۔

مجھے زیادہ ہوس نہیں — بس خواہش ہے —

البرٹؔ نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے اس کو دیکھا تھا — دونوں کی نگاہیں ملی تھیں — دونوں ایک تھے، جذبہ ایک تھا، خواہش ایک تھی۔ لیکن اس کے باوجود دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل تھی جو زیادہ بلند، زیادہ وسیع تو نہ تھی لیکن وہ کچھ سوچنے میں محو ہو گیا تھا — شدتِ احساس نے ایسی برہنگی کبھی اختیار نہ کی تھی — پھر — دل کی خلش جذبہ کی چبھن — اُس نے البرٹ کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیا تھا۔ وہ بالکل جیسے مدہوش ہو گیا تھا اور اس مدہوشی میں اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے البرٹ اس کی صرف اس کی ہو — اس کے دل میں ایک تیز و تند خواہش جاگ اُٹھی تھی کہ وہ البرٹ کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لے —

"البرٹؔ۔"

"ہوں۔"

"ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"میری منتشر زندگی کو ترتیب دے دو۔"

جواب دو —

"کیا —"

"یہی کہ تم مجھ سے بیاہ کرو گی۔"

البرٹ صرف مسکرادی تھی اور اس نے اس مسکراہٹ کو اثبات سمجھا تھا۔ اس کے قرب کے احساس سے اس کے جذبات میں آگ لگ رہی تھی۔ سارا جسم مجسم دھڑکن بن گیا تھا— اندھیرے کا جادو آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا اور وہ سمٹی جارہی تھی۔ تب یکبارگی اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اپنی بیش قیمت انگوٹھی اُتار کر اس کی قرمزی انگلی میں پہنادی تھی— محبت— بھینٹ— عقیدت— پیار— سچ— وہ خوشی سے جیسے پاگل ہوگیا تھا— اس نے اس کے ہونٹ چوم لیے تھے۔ اس کے ہونٹ البرٹ کے ہونٹ پر لرزتے رہے تھے اور پھر کانپتے ہوئے رخساروں کی طرف بڑھ گئے تھے— وہاں گلاب جیسی نرمی تھی— درمیان کچھ تھا اندھیرا— اس وقت اندھیرا کتنا اچھا لگتا تھا۔ کتنا پیارا، کتنا من موہک، کتنا خوبصورت، کتنا دلکش، کتنا گرم گرم— اس نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا— اگر وہ آن واحد میں دبوچ نہ لیتا تو شاید اس کا دل پھٹ جاتا— اس کی دماغ کی رگیں تن کر پھٹ جاتیں۔ ایسے لمحے کب آتے ہیں— کیوں آتے ہیں— دونوں ایک دوسرے کے قریب تھے۔ اتنے قریب کہ آنکھوں میں صبح کاذب کا سماں تیر رہا تھا— دل میں سورج— آنکھوں میں ایک شعلہ ایک سنگم— اس سے پہلے وہ کبھی اتنا خوش نہ تھا۔ اوپر ستارے مسکرا رہے تھے۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی سانسیں رک گئی ہوں، کائنات کی گردش ان نشاط آمیز لمحات کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی ہو— اور نیلا خوبناک آسمان— اندھیرے— یہ محبت— یہ گرمی— یہ تپش— یہ خوبصورت پروں کی نرمی— یہ کنول جیسا مخملی جسم— البرٹ کا جسم— جیسے سارا آسمان ہنس پڑا ہو— کوئی نہ تھا— صرف انسان اور محبت تھی— نہ جلیس نہ البرٹ— صرف ایک خیال، ایک شعر، ایک جذبہ— ایک حدت— ایک نگاہ— ایک شعلہ— ایک لمحہ— اور کچھ نہیں— لیکن وقت ایسا کہ چپ چاپ گزر جائے صرف گرد ہی گرد— ایک خلش— ایک چبھن جیسے کہ— آج اسے اپنے اندر ایک گھناؤنی اداسی، گھناؤنی سی خاموشی، گھناؤنی سی تاریکی محسوس ہوئی تھی— اس نے البرٹ کے اس فلیٹ کی طرف دیکھا وہاں اب بھی نیلگوں بلب روشن تھا—

اس نے دریچے سے باہر دیکھا۔ جوزف کا سایہ باہر تک رینگ آیا تھا— جیسے وہ کسی زندہ وجود کو اپنے سینے سے چمٹائے شب خون مارنے نکلا ہو— اس نے نفرت سے گلی میں تھوک دیا اور دریچہ بند کردیا۔

———— ۱۹۷۲ء

انگلی کا درد

میری انگلی میں کئی دنوں سے کھجلی ہو رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہیں جسم کے دوسرے حصوں میں نہ پھیل جائے اس لیے احتیاطاً اُسے سفید رومال سے ڈھک کر اپنی دوسری انگلیوں سے الگ رکھتا ہوں اور کھجلی مٹانے کے لیے پتھر کی سل کام میں لاتا ہوں جو دراصل چاقو تیز کرنے کے لیے مخصوص ہے۔ بہر حال میں ان دنوں کافی پریشان تھا— فیملی ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے چند عزیز دوستوں کے ساتھ ایک حویلی نما دُکان سے سل خرید لایا تھا لیکن اس آبنوسی رنگ نے کھجلی میں مزید اضافہ کیا تھا۔

دن کی روشنی میں تو کھجلی زیادہ پریشان نہیں کرتی لیکن شام ہوتے ہی سوزش شروع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ نیند میں بھی خلل واقع ہونے لگتا ہے اور کوئی چیز سہ رگ کے قریب ٹھوکے دینے لگتی ہے— اور مجھے بار بار احساس دلاتی ہے کہ کھجلی بڑھ رہی ہے— لیکن میں ہر بار بے توجہی سے گردن موڑ لیتا ہوں اور دائیں طرف سانس لیتے ہوئے چادر سے منہ ڈھک لیتا ہوں۔ لیکن عمل کے بعد بھی نیند نہیں آتی۔ ہر لمحہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ایسا وجود ہے جو مجھے متوجہ کر رہا ہے-- اُٹھو دو گھنٹہ گزر چکے ہیں دوسرے عمل کا وقت ہو گیا ہے۔

ہو گیا ہو گا— میں بدبداتا— مجھ سے اب نہیں اُٹھا جائے گا۔ مجھے زیادہ پریشان نہ کرو لیکن

میری درخواست کون سنتا۔ مجبوراً اُٹھتا ہوں، لیپ کرتا ہوں اور پتھر تک پہنچ جاتا ہوں۔ جس کا رنگ کالا ہے، جس پر ہلکے ہلکے ملائم ریشے ہیں۔

چائے کا پانی اُبلنے لگتا ہے تو کیتلی اسٹوو سے اُتار کر تپائی پر رکھ دیتا ہوں۔ تپائی کافی پرانی ہے جس کی ٹانگوں پر زرد پپڑیاں جم گئی ہیں۔ میں اس کی ٹانگیں کئی بار لیمو سے صاف کر چکا ہوں۔

میں نے نیلے رومال سے لال شیشی کا ڈھکن کھولا۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ میری صورت میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ منہ صاف کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ پانی ٹھنڈا ہو گیا—

کیتلی رومال سے تھام کر اسٹوو پر دوبارہ رکھ دی— ابال آنے میں دیر تھی— چہرے پر رومال رکھتے ہوئے میرا ہاتھ بلیڈ سے ٹکرایا— خون کی چند بوندیں سطح آب پر اُبھر آئیں۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا— اکڑوں بیٹھے بیٹھے ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔ دو تین بار ٹانگیں جھٹکیں، چہرے پر پانی کی بوچھاریں کیں۔

اب تک پانی اُبلا نہیں تھا۔ پتھر ابھی تک سامنے تھا۔ کوئی شئے اب بھی ٹھوکا دے رہی تھی۔ میں نے پھر اپنی انگلی اس پر رکھ کر زور سے دبائی۔ ابکائی آنے کو تھی کہ میں نے انگلی ہٹا کر دوبارہ چہرا دیکھا۔ ڈاکٹر پر لعنت ملامت کی۔ دوستوں کو گالیاں دیں۔ کیتلی اٹھانا چاہتا تھا کہ مجھے زور کی اُبکائی آئی— میں نے فوراً ٹیبلیٹ منہ میں ڈال کر چوسنا شروع کر دیا—

جب مجھے کچھ سکون ہوا تو میں نے گھڑی دیکھی— کئی بج چکے تھے... میں میز پر آ بیٹھا۔ میز کا غلاف بھیگا ہوا تھا۔ اس کی تمام چیزوں کو قرینے سے سجایا۔ سیاہی مائل پیپر ویٹ کی گرد انگلیوں سے صاف کی— قلم دان پر بھی دھول جم گئی تھی۔ سرخ اور نیلے رنگ کے دھبوں نے اُس کے آبنوسی جسم کو داغ دار بنا دیا تھا—

رائٹنگ پیڈ، لفافے، پن باکس، ایش ٹرے دائیں بائیں اُلٹے پڑے تھے انہیں ٹھیک کیا۔

پتھر کی سل اب بھی کافی گرم تھی— چاقو تیز کرنے کے لیے تپائی کے پاس جا بیٹھا۔ چاقو کی دھار دیکھی— اسٹوو بجھ گیا تھا۔ دوبارہ اُسے جلا کر کیتلی چڑھا دی۔ کیتلی کی تہہ میں دھند جم گئی تھی۔

کھجلی سے بے تاب ہو کر پتھر پہ اُنگلی رکھی اور بار بار کیتلی کے ڈھکن کو کھولتا اور بند کرتا رہا کہ کہیں پانی کے اُبال آنے سے پہلے ہی نہ دودھ چھوڑ دوں۔ میں اُنگلی بار بار اُٹھاتا، رگڑتا اور اوپر تک گھسیٹتا— اس عمل کے دوران دونوں ہاتھوں سے پتھر کو دبائے رکھتا پھر بھی وہ اِدھر اُدھر پھسلتا اور لڑھکتا رہتا—

کیتلی سوں سوں کرنے لگی تھی۔ اب میں انگلی تیز تیز گھس رہا تھا۔ میں نے چند ثانیے کے لیے انگلی روک لی تھی— اسٹوو میں ہوا کم ہو گئی تھی۔ ہوا بھرتے ہوئے کیتلی کے ڈھکن کو چھوا وہ کافی گرم ہو گیا تھا—

پانی!— اب کافی گرم ہو چکا تھا۔ انگلی دبی اور دوسرے کنارے تک پہنچ گئی اور میں نے کھلی کیتلی میں دودھ اُنڈیل دیا— اچانک نیند ٹوٹی تھی— سل نیچے لڑھک گئی تھی، کیتلی الٹی پڑی تھی، ایک چوہا اس پر بیٹھا اندر جھانک رہا تھا— بلّی دودھ چاٹ رہی تھی—

———— ۱۹۷۱ء

اٹھارہ نمبر

کوئی ایسا نشان بھی تو نہیں کہ تھا یہ پتہ چلتا کہ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا کیونکہ جب وہ مجھ سے ملنے کے لیے آتا ہے تو خوشبو کی کوئی لہر چھوڑ جاتا ہے کہ میں اس میں نہا جاتا ہوں۔

مگر آج ایسی کوئی بات نہیں تھی ـــــ مگر وہ آیا ضرور تھا کیونکہ اس کا ثبوت یہ کاغذ کا چھوٹا سا گلابی ٹکڑا ہے جس پر چند سیاہ لفظوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں ـــــ ایسے پھول کہ جس کے چاروں طرف کئی عدد نقطے برہنہ صورت میں کھلے پڑے ہیں۔

یہ ایک ایسا معمہ تھا کہ ہزار سلجھانے کے باوجود اس کے حل ہو جانے کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ آیا ہو اور اپنی خوشبو بستر میں لپیٹ کر آیا ہوتا کہ جب وہ واپس لوٹ کر جائے تو اپنے جسم کو بستر میں باندھ کر اس طرح ڈال دے کہ جیسے وہ کسی بھولے بھٹکے مسافر کا کوئی قیمتی اثاثہ ہے۔

مگر نہیں! وہ آیا تھا ـــــ ضرور آیا تھا اور اپنی خوشبو کا لمس اس ننھے کاغذ میں باندھ کر چلا گیا تھا جسے میں سونگھ کر، چکھ کر اور محسوس کر اپنی بے کیفی اور بے لذتی کو بھول جاؤں اور یہی محسوس کروں کہ وہ سامنے ہے اور اپنی خوشبوؤں کو انگلیوں میں لپیٹ کر جگہ جگہ ایسے نقش چھوڑ دیے ہیں جن میں ایک معنی خیزی بھی ہے اور لطف کی آمیزش بھی۔

یہ اخبار بھی تو اس کی آمد کا پتہ دیتا ہے۔ صفحہ ۳ کی ایک تصویر پر سرخ نشان بھی ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ اس وقت فوارے پر اٹھارہ عدد کے سیاہ نقطہ کو پڑھنے کی سعی کر رہا ہے۔

میں دروازے سے نکل کر پھر لوٹ جاتا ہوں اور سوچتا ہوں مجھے اب جانا نہیں چاہیے بلکہ اس گلابی کاغذ کے اس ننھے ٹکڑے، کو کسی خوبصورت پرندے کے بازوؤں میں باندھ کر فضا میں چھوڑ دوں تا کہ خوشبو کے ساتھ یہ ٹکڑا بھی اس تک پہنچ جائے اور وہ محسوس کرے کہ آئندہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت سرزد نہ ہو—اور وہ ہر لحہ پرندہ بن جانے کی سعی کرے تا کہ خلا میں پرواز کرتے ہوئے اس گھلی ہوئی خوشبو کو سمیٹ لے اور پی جائے—مگر شاید وہ ایسا نہ کر سکے کیونکہ تحلیل شدہ اشیاء آسانی سے اپنی اصلی صورت میں واپس نہیں ہو سکتیں، کچھ ایسی اشیا ضرور ہیں جو دوبارہ واپس لائی جا سکتی ہیں۔ مگر اس کے عمل میں ذہانت، وقت اور چند آپریٹس کی ضرورت پڑتی ہے۔

لیکن—میں بھی ایسا کیوں سوچوں اس خوشبو کو ضائع کیوں کروں بلکہ اس کو کسی بوتل میں بند کر کے میز پر رکھ دوں۔ یہی سوچ کر میں ریڈیو آن کر دیتا ہوں۔ مغنیہ کی آواز، ایک ایسی آواز جو کوئل کی آواز میں ہوتی ہے—

میں آم کا درخت ہوں، جس پر کوئی پھل نہیں۔ نغموں کی یہ حقیقت، لمحوں کی یہ سرسراہٹ، ضعیف درخت ہے جس میں کسی بار کو اٹھانے کی صلاحیت نہیں، وہ درخت جو پھل دار نہیں، جس کی شاخیں پتیوں سے خالی، کلیوں سے مبرّا ایک ستون کی مانند چپ چاپ کھڑا آسمان کو ہی تکتا رہے۔

درخت ایک ایسا درخت، جس کے چاروں طرف مٹی کی چوڑی دیواریں ہیں جس پر چند خارزار جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔ ایسی جھاڑی جس میں پھول کھلتے ہیں— کئی رنگوں کے پھول مگر کوئی ایسا پھول نہیں جو ثمر بہشت بن جائے سوائے اس کے کہ چند سخت اور کرخت پتھر اڑتے ہوں اور جسم کا سینہ یونہی پھوٹتا پچکتا رہتا ہو۔

بہرحال وہ ابھی تک تو آیا نہیں تھا۔ اس کے اس طرح نہ آنے میں کوئی بہانہ بھی تو نہیں۔ محض ایک وضع داری تھی—اور اس وضع داری میں مَیں اپنے دامن کو اور زیادہ وسیع کرتا چلا جاؤں اور جس کی وسعت میں کئی رنگوں کی خوشبو سمیٹ لوں تا کہ کلیاں ملیح چہرے پر مہک سکیں۔

مگر یہ ممکن ہی کہاں—جب وہ آیا ہی نہیں تو یہ سب سوچنا فضول اور بے کار ہے۔ اگر بالفرض محال وہ آیا بھی تھا تو کہاں چلا گیا۔ اس کے اس طرح چلے جانے میں ایک طرح کی ہتک تھی، توہین تھی اور

میں اس پراگندہ ماحول میں خود کیسے بچا سکتا ہوں جبکہ شبہ کے انگنت کٹیلے اور نوک دار کانٹے میری طرف بڑھتے ہی چلے آتے ہیں اور جن سے میرا جسم محفوظ نہیں رہ سکتا۔

ہوسکتا ہے میں خود کو محفوظ نہ رکھ سکوں اور لہولہان ہوجاؤں اور پھر اس لہو میں کرب کی، درد کی گھٹن سمیٹ کر مجھے جامد کردے گی اور پھر میں ہمیشہ کے لیے اس کو کھودوں گا۔ ایک ایسی دوری جس میں ناامیدیاں عفریت بن جائیں گی۔

لیکن میں اس جنگ کے لیے اس پر کوئی الزام نہیں رکھ سکتا۔۔۔ کیونکہ الزام رکھنا ایک ایسا گناہ ہے جس پر تخریب کی آمادگی ظاہر ہوتی ہے اور پھر ہر لحہ ٹوٹ جانے کے لیے، بکھر جانے کے لیے آمادہ ہونے لگتا ہوں۔ اس آمادگی میں سپردگی، خودگذاشتگی اور بے پناہ نرمی کا احساس شامل ہوجاتا ہے۔ یہ احساس مجھے ان خوشبوؤں کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں انگنت رنگوں کی مجلس ہے اور اس مجلس میں آنسوؤں کے بدلے قہقہے ہیں، آنسوں کے بدلے نغموں کی پھوار ہے۔۔۔ ایک ایسی پھوار جس میں تمام بدن بھیگ جاتا ہے اور سردی معلوم ہونے لگتی ہے۔ میرا جسم لہلہانے لگتا ہے اور میں کچھ دیر کے لیے یہ بھول جاتا ہوں کہ میں کمرے کے چکنے فرش پر کھڑا ہوں اور اس ساتھی کا انتظار کررہا ہوں جو میرا ہاتھ تھام کر چکنے فرش پر دوڑتا چلا جائے گا اور پھر ہم دونوں پھسلتے پھسلتے ایک ہوجائیں گے اور ایک ایسے نقطۂ اتصال پر جمع ہوجائیں گے جہاں دوئی کا نقطہ ممنوع ہوگا۔

ایک ایسے شجر ممنوعہ کی طرح جس کے پھل کھانے پر آدم کو سزا ملی تھی کہ اس کھردری دنیا میں جاکر اسے آباد کریں۔۔۔ اور پھر ایک طویل دائرے میں پھیلی ہوئی دنیا میں ایک ایسے انسانوں کی دنیا بسی تھی جو ننگے رہتے تھے، شکار کھیلتے تھے، کچا گوشت کھاتے تھے۔ گپھاؤں اور پیڑ کی ڈالوں پر رہتے تھے اور آپس میں جنگیں کیا کرتے تھے۔۔۔ اور پھر قبیلوں میں تقسیم ہوئے اور سردار بنے، آقا اور غلام کی اصطلاح رائج ہوئی۔ ایک انسان دوسرے انسان کو جانور کی طرح پالنے لگا۔ برتری اور کم تری کا جذبہ فروغ پانے لگا۔ ذاتیں بنیں، مذاہب کے اعتبار سے گروہ بنے، دیوی، دیوتا کی پوجا شروع ہوئی۔ سورج، چاند، پانی طاقت کی علامتیں بن کر انسانوں کو عبادت کی طرف راغب کیا۔

دنیا آگے بڑھتی رہی، تہذیبیں بنتی اور مٹتی رہیں۔۔۔ پھر ایک دن ایسا وقت آیا کہ انسان جاگیردار بنا، مزدور اور مالک کی اصطلاح رائج ہوئی۔۔۔ حاکم و محکوم کا رشتہ ٹوٹنے لگا تو فساد ہوئے، جنگیں ہوئیں، خون بہا۔۔۔

لیکن دنیا طرح طرح کے انسانوں سے اپنا دامن بھرتی رہی۔ تہذیبیں بدلیں، اقدار بدلے لیکن انسان پھر بھی مہذب نہ ہوسکا۔ جانوروں کی طرح آج بھی خون کرتا ہے، فساد کرتا ہے، جنگیں کرتا ہے، نفاق کے بیج بوتا ہے—

لیکن میں اب بھی کمرے میں ہوں۔ سوچتا ہوں ایک جنگ جو دشمنوں کے مابین ہوتی ہے اور ایک جنگ دو دوست کے درمیان ہوتی ہے، جب دو دوست مزرع شب میں معرکہ آرائی کرتے ہیں اور باہم ایسی لوٹ کھسوٹ کہ موم شمعیں پگھلنے لگتی ہیں، خوشبوئیں سلگنے لگتی ہیں اور نیلے آسمان پر قوس و قزح لہرانے لگتی ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار اور اس پھوار میں نغمہ کی تخلیق— ایک ایسی تخلیق جو آدم میں تھی جو کل کے انسانوں میں تھی۔

بہرحال وہ آیا تھا یا نہیں آیا تھا، یہ سمجھنا ذرا مشکل تھا— لیکن میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میری انگلیوں میں پھنسا یہ گلابی کاغذ سفید پڑتا جا رہا ہے اور ایک آواز سنائی دیتی ہے جیسے وہ کاغذ کا ننھا ٹکڑا سرگوشی کر رہا ہو اور مجھے فوارے کی طرف چلنے کی تلقین کر رہا ہے، مجبور کر رہا ہے اور پھر یکلخت ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں فوارے کی طرف جا رہا ہوں جہاں وہ میرا منتظر ہے— اور میرے چہرے پر ۱۸ نمبر کا نقطہ پھیلتا جا رہا ہے۔ پھر میں دیکھتا ہوں تو کمرہ کہیں دور پیچھے رہ گیا ہے اور میں اس گلابی کاغذ کے ٹکڑے پر ۱۸ عدد کے سیاہ نقطہ میں فوارہ دیکھ رہا ہوں، جو میرے سامنے ہے اور وہ ۱۸ عدد کے پائدان پر کھڑا مسکرا رہا ہے۔

———— ۱۹۷۴ء

رسّی، سانپ اور مینڈھک

کنوئیں کی جگت پر خالی گھڑوں کی بھیڑ تھی۔ رسّی گراڑی سے جھول رہی تھی۔ منڈیر پر بیٹھا کوا قاں قاں کر رہا تھا۔

جگت عورتوں سے خالی تھی۔ پانی کی ایک بوند بھی کہیں نہیں چمک رہی تھی۔ صرف جگت سے ملی پکی نالی میں گندے اور باسی پانی کی لکیر سکڑی پڑی تھی۔

میں ادھر سے گزرا، کنوئیں میں جھانک کر دیکھا، اندر کافی اندھیرا تھا۔ ایک مینڈک ایک سانپ کے ساتھ تیر رہا تھا—

کنواں کافی پرانا تھا۔ کسی بنئے نے بنوایا تھا۔ وہ تو کب کا مرکھپ چکا ہاں اس کا بڑا پوتا دینا ناتھ کرانے اور غلہ کی دُکان کرتا ہے۔

یہ سرائے کافی پرانی ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے سرائے کی مرمت اور توسیع کی تھی۔ اس کے عہد میں سرائے میں بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ دور دراز کے مسافروں سے زندگی تروتازہ اور شگفتہ تھی۔ سنتے ہیں فائہان اور ابن بطوطہ بھی یہاں ٹھہرے تھے۔ اس سرائے کی بھٹیارن کا خاندان کب کا مرکھپ چکا ہے یا ہوسکتا ہے کہ وہ بڑی بڑی ذاتوں میں تقسیم ہو چکا ہو—

ان دنوں اس کے مالک ایک خاں صاحب ہیں —— وہ سرائے تو کہیں نظر نہیں آتی —— صرف نام چلا آتا ہے۔ سڑک کے دونوں جانب پختہ دُکانیں ہیں۔ انہی دُکانوں میں سے ایک میں مولوی جفا صاحب کی بھی کتابوں کی دُکان تھی۔ اکثر باذوق حضرات شام کو وہاں یکجا ہوئے۔ شعر و ادب کی محفل گیارہ بجے رات تک جمی رہتی —— لیکن خاندانی جھگڑوں اور مقدمہ بازی نے ان کی ساری دولت ہی نہیں ساری شگفتگی اور بذلہ سنجی تک چھین لی۔ اب ان کی زندگی ایک پاگل نما شخص جیسی ہے۔

یہ سرائے اپنے سینے میں تاریخ و ادب کا بیش بہا خزانے دفن کیے ہوئے ہیں۔ یہ سرائے جواب قصبہ کا ایک محلہ ہے، جس کی آبادی زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل ہے——

چوراہے پر ایک پرانا نیم کا درخت ہے جس پر ایک کوے نے جھونج لگا رکھا ہے۔ جھونج کافی اونچائی پر ہے۔ بچہ اکیلا ماں کا منتظر ہے اور ماں کنوئیں کی مُنڈیر پر قاں قاں کر رہی ہے۔

میں دُکان سے دہی لے کر واپس لوٹ رہا تھا۔ میرا کتا خاں صاحب کی دہلیز میں بندھا ہوا بھونک رہا تھا۔ میں نے خاں صاحب سے کہا۔ ''یہ میرا کتا ہے، کل رات بھٹک گیا تھا۔'' میں نے کتے کی رسّی کھولتے ہوئے کہا۔ خاں صاحب اٹھ کر اندر کی طرف جا رہے تھے اور کتا بھی میرے ہاتھوں سے رسّی چھڑا کر اندر بھاگ گیا تھا——

خاں صاحب کے ہاتھوں میں گوشت کے کئی ٹکڑے تھے۔ میں نامراد واپس لوٹ آیا۔ کتا بھی لوٹ آیا۔ شاید اس کی بھوک مٹ گئی تھی۔ اس کے گلے میں اب بھی ناریل کی رسّی جھول رہی تھی——

راستے میں میرا دوست اتل رائفل لیے کنوئیں کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اس کو روکتے ہوئے پوچھا۔ ''سانپ کو مارو گے؟'' وہ بولا ''ہاں!'' میں نے کہا۔ ''سانپ کا گھر ہی کنواں ہے، کیوں پانی گندا کرتے ہو''—— اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید جلدی میں تھا—— میں نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود بھی دہی لیے کتے کے ساتھ کنوئیں کے قریب گیا——

گھڑے اب بھی خالی تھے۔ کوا نہیں تھا۔ آس پاس چند عورتیں کھڑی تھیں۔ بچوں کے ہاتھوں میں غلیلیں تھیں۔ کتے نے اندر جھانک کر دیکھا اور یک لخت واپس مڑا۔ کئی پنجے زمین پر مارے، گھر کی طرف بھاگا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑ پڑا——

دن کے ایک بج رہے تھے۔ دھوپ کافی تیز تھی۔ میں نے بستر کھولتے ہوئے کتے کی پیٹھ سہلائی، اس نے دم ہلائی اور امرود کے درخت کے پاس جا کر منہ جھکا لیا——

میں سو کر اُٹھا تو شام ہو چکی تھی۔ پوسٹ مین خط ڈال گیا تھا۔

میں نے چائے پیتے ہوئے دیکھا۔ قلم نہیں تھا۔ سیاہی سوکھ گئی تھی۔ میں نے کاغذ اُٹھایا، الفاظ ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ میرا قلم کہیں کھو گیا تھا۔ قلم ڈھونڈنے کے لیے باہر جھانکا، کتا باہر برآمدے میں دُم ہلا رہا تھا۔ دہی کی پلیٹ ٹوٹی پڑی تھی۔

میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ کتا غائب تھا۔ چائے کا آخری گھونٹ لے کر چوہے کو دیکھا جو بل سے جھانک رہا تھا۔ بلّی میز کی آڑ میں چپکی ہوئی بیٹھی تھی، میری چھینک نے بلّی کا دھیان موڑ دیا۔ چوہا غائب تھا۔ اب میں اکیلا تھا۔ کنوئیں پر کافی بھیڑ تھی۔ لوگوں نے پورے دن پانی نہیں پیا تھا۔ گاؤں میں صرف یہی ایک کنواں تھا جس میں سانپ تھا——

میں نے کنوئیں کے اندر جھانک کر دیکھا، سانپ اور مینڈک اب بھی تیر رہے تھے۔ منشی تیراک رسّی کے بل نیچے اُترا۔ عورتوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ بچوں نے اپنی غلیلیں پیچھے چھپالی تھیں، مردوں نے بیڑیاں بجھا کر کان پر رکھ لی تھیں اور میرے دوست انل نے اپنی رائفل نیچے جھکالی تھی۔ میرا کتا بھی ایک کنارے ایک عورت کے پاس کھڑا زبان نکالے ہانپ رہا تھا——

پھر جیسے ایک طوفان آگیا ہو۔ دوست نے رائفل ٹھیک کر لی تھی۔ بچوں نے غلیلیں سیدھی کر لی تھیں—— عورتیں دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھیں—— سب کی نظریں منشی تیراک کی طرف اُٹھ گئیں۔ کتا میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا—— سب نے دیکھا، اس کے بائیں ہاتھ میں رسّی کا ایک ٹکڑا اور مینڈھک کی ٹانگ جھول رہی تھی۔

——————۱۹۷۰ء

حیرتی ہے آئینہ

اس نے ابھی وہ کاغذ اُٹھایا ہی تھا کہ ایک چیخ سنائی دی۔ رُک جا کمینے، بدمعاش، وہ سہم کر دو قدم پیچھے ہٹا اور ماسٹر صاحب کے مکان کی پچھلی گلی تک دوڑتا چلا گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا جیسے اُس نے کسی کو مار ڈالا ہو، قتل کر دیا ہو۔ گلی میں اتنا کافی اندھیرا تھا کہ وہ کچھ دیر ٹھہر کر اپنی سانس درست کر سکتا تھا۔ پھر اس نے سوچا یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے کون سا جرم کیا تھا جو اس طرح بدحواس ہو کر بھاگ آیا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہو نہ ہو یہ چیخ رکمنی کی ہو جو کلوا مہاجن کی دُکان کے عین سامنے ایک کچی کوٹھری میں رہتی ہے۔ اس کا شوہر کسی مل میں کام کرتا ہے۔ رات گئے دارو پی کر ہی لوٹتا ہے۔ معصوم رکمنی — ہو نہ ہو اُس نے ہی اسے مارا ہو مگر ابھی رات ہی کتنی گزری ہے، ٹھیک دس بجے ہیں۔ وہ تو ابھی لوٹا بھی نہ ہوگا۔ پھر یہ چیخ اور گالی گلوج کیسی؟ وہ اپنے شوہر کو گالی تو دے ہی نہیں سکتی۔ کیا مادھو گنڈہ تو نہیں جو اس کے حسن کا پیاسا تمام دن کلوا مہاجن کی دُکان پر بیٹھا انٹ سنٹ بکا کرتا ہے۔ ضرور اسی کی حرکت ہے۔

رکمنی بے چاری کتنی معصوم اور سندر ہے — ہے تو واقعی بے پناہ خوبصورت۔ سپید سرخ رنگ، بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، ستواں ناک، پھولے پھولے گال، رس بھرے ہونٹ اور ٹھوڑی پر کالا تل۔

اس نے بھی اسے ایک بار دیکھا تھا تو دل میں ہلچل مچ گئی تھی۔ وہ بھی تو کئی بار اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کلوا مہاجن کی دُکان پر کسی نہ کسی بہانے پہنچا تھا۔ کبھی نوٹ بھنانے کبھی دو پیسے کی بیڑی لینے۔

لیکن یہ چیخ کیسی ــــ کیا کسی نے دست درازی کی ــــ کیا کسی نے مجبور ہو کر یہ گھناؤنی حرکت کی، شاید وہ زیادہ دن اس کا فراق برداشت نہیں کر سکتا۔ تبھی تو یہ حادثہ رونما ہوا۔ ورنہ وہ پہلے ڈورے ڈالتا، لالچ دیتا تو ہو سکتا تھا وہ رام ہو جاتی اور اپنے آپ کو بغیر کسی حیل وحجت کے اپنے آپ کو سپرد کر دیتی۔

لیکن اس نے پھر سوچا رکمنی ایسی عورت نہیں۔ وہ انتہائی پاکباز اور شوہر پرست عورت ہے جس کے دھرم میں مرد اس کا خدا ہوتا ہے۔ وہ یہ گھناؤنا کام نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے بدشکل اور ظالم شوہر کا ہر ظلم برداشت کر سکتی ہے مگر ایسا نہیں کر سکتی۔

ضرور مادھو نے ایسی حرکت کی ہوگی۔ چل کے مجھے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ آخر کیا بات ہے۔ ابھی اُسنے قدم اٹھایا ہی تھا کہ نواب دلدار کا سراپا اس کے سامنے گھوم گیا۔ ۶ فٹ کا قد آور نواب، بڑی بڑی مونچھیں، سرخ آنکھیں، رعب دار چہرے نے اس کے قدم وہیں روک دیئے۔ وہ کب گھر سے نکلا تھا کہ جا کر شیرا کے یہاں سے تمباکو لائے مگر وہ تھا کہ اب تک یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔

نواب دلدار کی کوٹھی محلے کے دوسرے سرے پر واقع تھی جس کے ارد گرد کھیت اور باغات تھے۔ وہ بچپن سے ہی نواب کے یہاں نوکر ہو گیا تھا۔ پہلے اس کا باپ ہی اس کی جگہ کام کرتا تھا لیکن اس کی وفات کے بعد نواب نے اسے کہیں اور جانے نہیں دیا۔ اس کی ماں تو اس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی۔ وہ اچھی طرح ماں کی شکل بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کا قد بھی اس کے باپ کی طرح قد آور تھا اور نواب صاحب نے اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہیں کی۔ وقت کا بیشتر حصہ کوٹھی میں گزارتے اور صرف مہینے میں ایک بار دہلی ضرور جاتے اور وہاں سے لوٹتے تو ان کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ رہتی اور جانے وہ جلال کہاں چلا جاتا تھا۔ وہ نواب صاحب کی اس تبدیلی پر حیرت کرتا لیکن اس کے پاس اتنی عقل ہی کہاں تھی کہ وہ کچھ سوچ سمجھ سکتا۔ بس ان دنوں اس کی موج ہی موج ہوتی اسے تنخواہ سے زائد ہی کچھ رقم مل جاتی۔

نواب دلدار غصہ سے پیچ وتاب کھا رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی بولے کیوں بے کہاں رہ گیا تھا۔ پھر خود ہی بولے ہاں ہاں میں جانتا ہوں وہ کلوا مہاجن کے یہاں گیا ہوگا۔ میں اس سالے کی دُکان پھنکوا دوں گا تبھی اس محلہ کی غنڈہ گیری ختم ہوگی۔ وہ سالا اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔ بڑا سادھو بنتا ہے اور خود دوسروں

کی عورتوں پر ڈورے ڈلواتا ہے۔ میں سالے کی کھال کھنچوادوں گا۔ سالا اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔

پھر دلدار اس کی طرف گھور کر بولے ابے چپ کیوں ہے؟ بولتا کیوں نہیں۔

وہ بڑی دیر تک نواب صاحب کی باتوں پر غور کرتا رہا اور اسے بار بار وہی چیخ سنائی دیتی رہی۔ جانے کب اُسے نیند آئی جب اس کی آنکھ کھلی تو اندھیرا چھٹنے لگا تھا اور نواب صاحب کے کمرے میں حسب معمول نیلی روشنی ہو رہی تھی۔ شاید وہ آج کچھ پہلے ہی جاگ گیا تھا۔ اٹھتے ہی ایک بھرپور جماہی لی، چلم بھری اور لوٹے میں پانی لے کر ندی کی طرف چلا تو اُس نے دیکھا ایک سایہ بڑی پھرتی کے ساتھ ماسٹر صاحب کے مکان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آنکھیں پھیلادیں لیکن یہ پہچان نہ پایا کہ وہ سایا کس عورت کا تھا۔ وہ بڑی دیر تک اس سائے کو دیکھتے رہا اور دل میں ایک شوق تجسس لیے وہ آگے بڑھ گیا۔

کلوا مہاجن کی دُکان ابھی کھلی نہیں تھی۔ رکمنی برتن مانجھنے میں محو تھی اور اس کا شوہر ابھی تک پڑا کھراٹے لے رہا تھا۔ رکمنی برتن مانجھتے وقت بڑی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں وہ شوخی اور شرارت نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ سرخی مائل دھبے تھے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ رات بھر روئی ہے تڑپی ہے۔

اُس نے رکمنی سے کبھی بات کرنے کی ہمت نہیں کی تھی ورنہ وہ اس سے پوچھتا کہ رات کیا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ جب تک وہ لوٹا اس وقت تک کلوا مہاجن کی دُکان کھل گئی تھی مگر مہاجن کی جگہ مادھو بیٹھا گاہکوں کو نپٹا رہا تھا۔

وہ چند لمحے کے لیے رُکا اور اُس نے اس کی طرف ایک نگاہ اٹھائی تھی کہ مادھو بول پڑا۔ کہو اتنی صبح صبح کیسے آنا ہوا۔ لو بیڑی پیو۔ اُسے سخت حیرت تھی کہ آج مادھو میں تبدیلی کیسی۔ اس نے مادھو کی نظر بچاتے ہوئے اس بار جے کی طرف دیکھا سیٹھ کی لونڈیا دھوپ میں صرف ایک بلاؤز اور انگرکھا پہنے بال سکھا رہی تھی۔ اس کے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ اس وقت چونکا جب مادھو نے پکارا۔ کیوں زیادہ چڑھ گئی ہے کیا۔ ذرا سمجھ بوجھ کر۔ اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اس کی چوری پکڑ لی گئی تھی۔ اگر دیکھنے کا بہت زیادہ شوق ہے تو اپنی بائیں طرف دیکھ۔ سمجھے۔ وہ کھسیا کر اُٹھ گیا۔

نواب صاحب کو کھانا کھلاتے وقت وہ بغور ان کا چہرا دیکھتا رہا مگر اس کی چوری پھر پکڑی گئی۔ نواب صاحب نے مسکرا کر پوچھا تم کو آج کیا ہو گیا ہے جو اس طرح کھوئے کھوئے نظر آرہے ہو۔ نواب

صاحب کا لہجہ انتہائی نرم تھا۔ وہ کچھ بول نہ سکا صرف انگوٹھے سے زمین کھرچتا رہا۔ ہاں سنو کل شام میں دہلی جاؤں گا تین دن بعد لوٹوں گا۔ میری واپسی تک کھیتوں کی دیکھ بھال بھی تمہارے ذمہ ہوگی۔ میں نے مزدوروں سے کہہ دیا ہے کہ تمہاری نگرانی میں ہی بقیہ کھیت کی کٹائی ہوگی۔ امید ہے تم اپنا کام ذمہ داری سے نبھاؤ گے۔

نواب صاحب تین دن بعد لوٹے تو ان کے چہرے پر وہ تازگی اور رونق نہیں تھی جو اس کے پہلے واپسی میں ہوا کرتی تھی بلکہ وہ بے حد نڈھال اور بیمار سے نظر آرہے تھے۔ اسے انتہائی تعجب تھا اور ایک طرح کی پریشانی لاحق تھی۔ اسے جانے کیوں نواب صاحب کی یہ صورت دیکھ کر بڑا دکھ ہوا تھا۔ لیکن اس نے وجہ جاننے کی جرأت نہیں کی بلکہ خاموشی سے ہولڈال لیے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

رات اپنے ساتھ کئی دکھ بھری کہانی لائی تھی۔ اس نے بھی اٹھ کر دیکھا نواب صاحب کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ شاید نواب صاحب رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ اُن کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ رخساروں پر آنسوؤں کے دھبے تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے نواب صاحب عرصہ بعد جی کھول کر روئے ہوں۔

کئی دن سے کلوا مہاجن کی دُکان بند تھی اور مادھو بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کئی بار اس طرف سے گزرا کہ وہ اس ''بجلی'' کو دیکھ سکے جس نے اس کے خرمن ہستی کو پھونک ڈالا تھا۔ البتہ رکمنی کے دونوں دروازے اور درمیانی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

مہاجن کے مکان کا صدر دروازہ بھی بند دکھائی دیا۔ ہوسکتا ہے مہاجن بیمار ہو یہ سوچ کر اُس نے کنڈی کھٹکھٹائی کہ دُکان بند کردینے کی وجہ معلوم کرسکے۔ اُس نے ابھی کنڈی اُٹھائی ہی تھا کہ عقب میں ایک آواز سنائی دی۔ کس کو پوچھ رہے ہو؟ کلوا مہاجن اب یہاں کہاں۔ وہ تو پرسوں ہی یہاں سے چلا گیا۔ اس کی لونڈیا اور مادھو میں جنسی تعلقات تھے۔ مہاجن نے کئی بار اپنی لونڈیاں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر جب عاجز آگیا تو اُس نے یہ گاؤں ہی چھوڑ دیا——

مگر وہ اس بات کا یقین کر لینے پر آمادہ نہ تھا بلکہ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا اور پھر ارادتاً اس کے قدم رکمنی کے مکان کی طرف اُٹھ گئے جہاں وہ دروازے پر فاتحانہ انداز میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

———— ۱۹۷۲ء

مزارِ خشت

اس نے گھبرا کر پردے کھینچ دیئے اور خود کو کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر ڈال دیا۔ آنکھیں اشکبار تھیں تو دل کی دھڑکنیں آہنی ہتھوڑی کی طرح اس کے تصورات پر برس رہی تھیں۔ احساس کا زخمی پرندہ اک لاش بے کفن کی طرح تیرہ و تاریک کمرے میں منھ چھپائے ہولے ہولے سسکی لے رہا تھا۔ سارے جذبات، ساری خواہشیں شکستہ آئینے کی طرح چکنا چور ہوگئی تھیں اور جس کے ریزے اس کی روح کو چھید رہے تھے اور اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ صدہا چیونٹیاں اس کے جسم میں رینگ رہی ہوں اور دنیا ومافیہا سے بے خبر ساکت و صامت سنگلاخ زمین پڑی ہوئی اپنی مزارِ خشت پر آنسوؤں کے پھول چڑھا رہی تھیں۔

جب وہ ایک معصوم اور نازک سی بچی تھی اسی طرح کھردرے فرش پر کلکاریاں مارا کرتی تھی اور اپنی معصوم مسکراہٹوں سے خالی ماحول میں مسرت و شادمانی کے ستارے جڑتی رہتی تھی۔ لیکن آج وہ فرش پر بجائے کلکاری مارنے کے سسکاری لے رہی تھی۔

جب وہ اپنے ننھے منے قدموں پر تھرکتی چلتی تھی تو ساری کائنات رقص کرنے لگتی تھی اور ہر آغوش اُسے پیار کرنے کے لیے وا ہو جایا کرتے تھے۔

جب وہ توتلی زبان سے امی کہتی تو اماں کے چہرے پر انگنت پیار کے کنول کھل اٹھتے تھے۔ ابا دیکھتے تو ان کی باچھیں کھل اٹھتی تھیں۔ وہ اپنی معصومانہ حرکتوں سے ماں کی ممتا کو دو چند کر دیتی تھی۔

جب وہ گڈے گڑیا کا بیاہ رچاتی، ہنڈ کُلیا پکاتی اور جھولا جھولتی، ہٹ کرتی، روتی، ضد کرتی تو جانے کتنے کے دل اس کی محبت میں سرشار ہو جاتے۔ جاوید بھی تو اس کا ہم عمر تھا۔ کتنا چاہتا تھا اس کو۔ اپنے گھر کی مٹھائی، پھل چوری چھپے لایا کرتا تھا اس کے لیے۔ وہ اس سے لڑتی تو وہ روٹھ جاتا لیکن پھر من جاتا۔

جب وہ اسکول جانے لگی تو اماں دروازے کی آڑ سے اسے جاتے اس وقت تک دیکھتی رہتی جب تک وہ دکھائی دیتی۔ وہ جاوید کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنستے کھیلتے اسکول پہنچ جاتے۔ جانے کب تک وہ ایک ساتھ ہنستے بولتے اسکول پہنچ جاتے۔

پھر وہ دن بھی آیا جب جاوید ہمیشہ کے لیے دوسرے شہر کو چلا گیا۔ وہ اس کی قربت سے ایسا محسوس کرنے لگی تھی جیسے جاوید اس کا ہے کوئی اس سے اُسے جدا نہیں کرسکتا۔ اس کے جانے کے بعد اس کے جانے کا احساس شدید ہوگا۔ وہ سوچتی اب تو وہ کافی بڑا ہوگیا ہوگا۔ کتنا خوش ہوگا۔ کاش وہ پھر اس سے آکر مل جاتا— لیکن ابا کی غربت نے مجھے ایک ایسی منزل پر لا کھڑا کیا جہاں بیٹی کا سودا ہوتا ہے۔ جہاں بیٹی بیچی جاتی ہے۔ جانے کتنے بازار سجتے ہیں۔

اور وہ بھی ایک ایسی ہی بیٹی تھی جو بیچی نہ جاسکی بلکہ ایک بوڑھے کے ہاتھوں رہن رکھ دی گئی۔

اس کے بھی اپنے جذبات تھے۔ اس کی بھی اپنی دنیا تھی۔ اس کے بھی انگنت خواب تھے۔ ایک چھوٹے مگر خوبصورت گھر کی ایک چاہنے والے شوہر کی لیکن وہ ایک ایسے شخص کی بیوی بنادی گئی جو شوہر سے زیادہ اس کا رکھوالا لگتا۔ اس کی ریکھ دیکھ کے لیے ایک آیا رکھی، ایک چوکیدار رکھا کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائے، کہیں اس کی قید سے آزاد نہ ہو جائے۔

اس کے باپ اس کے یہاں مقیم تھے۔ اتنا ملتا کہ مشکل سے گزر ہوتی اور گرانی تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ باپ ہزاروں کے قرض دار ہوئے تو اس شخص نے اس کو رہن رکھ کر باپ کا قرضہ اتار دیا۔ گھر بکنے سے بچ گیا اور باپ جو مجبور تھا یا مجبور کر دیا گیا تھا۔ اور میرے ابا کی طرح لاکھوں باپ اسی طرح مجبور کر دیے گئے ہیں۔

بعض لمحہ وہ یہی سوچتی کاش! مجھے جاوید کو سونپ دیا جاتا۔ وہ تو سب کچھ تھا۔ وہ انکار نہ کرتا—

لیکن میں تو ایک غریب باپ کی بیٹی تھی جس کی سماج میں کوئی عزت نہیں تھی۔ جس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ شاید ہم لوگ ان بڑے امیروں کی خدمت کے لیے ہی پیدا کیے جاتے ہیں۔

اور آج کا دن ہے کہ جب وہ مصنوعی شوہر اس سے شوہری دکھاتا ہے تو اسے شرم آنے لگتی ہے اور اس پر ہنسی۔

۱۹۶۷ء

جنگل کا راجہ

ایک لکیر دور تک کھنچتی چلی گئی تھی۔ پاس ہی چند سفید ٹکڑے پڑے ہوئے تھے اور ننھا جاوید اس کے پاس بیٹھا انگلیاں گن رہا تھا۔

یکلخت وہ اٹھا، اپنے پلاسٹک کے چند جانوروں، انسانوں اور پرندوں کو اٹھالایا اور ایک ایک کر کے ان کی تعداد گنی اور پھر انہیں الگ الگ خانوں میں رکھتا جاتا۔ یہاں تک کہ وہ سب کچھ بھول کر رونے لگا۔ ایک شیر نے اس کے خوبصورت کتے کو مار ڈالا تھا۔

وہ انتہائی غصہ اور غم کی حالت میں اپنا پستول اُٹھالایا اور پے در پے کئی فائر کر کے شیر کو مار کر ہنسنے لگا۔

وہ سارا سامان اسی طرح بکھرا چھوڑ کر ایک چھوٹے سے گلاس میں پانی پینے لگا۔ اس کی سفید بکری ممیائی تو اس نے اپنی بانہیں اس بکری کی گردن میں ڈال دیں۔ وہ بڑی دیر سے یہی متضاد حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی ہنستا تو کبھی رونے لگتا یہاں تک کہ وہ تھک گیا اور صوفے پر جا کر سو گیا۔

ایک خوبصورت باغ تھا جہاں رنگ برنگ کے پرندے شاداب ڈالیوں پر پھدک رہے تھے۔ تتلیاں پھولوں پر منڈلا رہی تھی۔ خوبصورت چوپائے نہروں کے آس پاس اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ ایک

عجیب طرح کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی کہ ایک شیر آتا دکھائی دیا۔ پرندے ڈالیوں میں چھپ گئے۔ تتلیاں پھولوں کی آغوش میں سوگئیں۔ چوپائے ادھر ادھر اوٹ میں ہو گئے۔ جو باغ ابھی تک جاگ رہا تھا اچانک سوسا گیا تھا۔ وہ شیر ایک درخت کے پاس آکر ادھر ادھر نظر دوڑا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظریں ایک بکری پر پڑی جو خوف سے ایک جھاڑی میں چھپی بیٹھی تھی۔ شیر نے اس پر حملہ کردیا۔ وہ چیخ پڑا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ خوفزدہ آنکھوں سے اپنے ان پلاسٹک کے کھلونوں کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں ایک بکری غائب تھی اور شیر بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک اسی حالت میں پڑا حالات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اُٹھ کر اُس نے شیر کو ایک ڈبے میں بند کردیا۔

اب وہ مطمئن تھا اور اس نے سارا سامان سمیٹ کر اس چھوٹے تخت پر ڈال دیا اور اپنی سفید چاک اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اس نے ماں سے پوچھا۔ امی شیر جنگل کا راجہ ہوتا ہے نا — اور سارے جانور، پرندے اس کے پرجہ ہوتے ہیں۔

تو ماں — شیر کیا بہت طاقتور ہوتا ہے؟

ہاں بیٹے — وہ بہت طاقتور ہوتا ہے اسی لیے تو راجہ ہوتا ہے جنگل کا۔

ماں — وہ راجہ کیسا جو اپنی پرجا پر ظلم کرے اور اپنے سے کمزوروں کے خون کا پیاسا ہو؟

بیٹے — یہی جنگل کا قانون ہے۔ وہ بلا وجہ کسی کو نہیں ستاتا بلکہ جب اس کو بھوک لگتی ہے تو اپنی بھوک مٹانے کے لیے کسی جانور کو پکڑ کر کھا جاتا ہے۔

ماں — یہی جنگل کا قانون ہے تو اگر یہی قانون اپنے ملک میں رائج ہو جائے تو کیا ہوگا۔ اگر اپنے ملک کا راجہ بھی ایسا کرنے لگے تو اس کی پرجا کیا کرے گی؟

بیٹے — اس کی پرجا ایسے راجہ کو گدی سے اُتار کر کسی نیک انسان کو راجہ بنا دے گی۔

ماں — اور میں ایسے راجہ کو ماردوں گا — اور وہ دوڑا دوڑا اس ڈبے کو اٹھا لایا جس میں شیر بند تھا، جنگل کا راجہ۔

——— ۱۹۷۰ء

دائرے کی موت

میں جب بھی گھر سے باہر قدم نکالتا ہوں، کوئی عقب سے پوچھتا ہے کہ تم کہاں جارہے ہو؟ وہ جگہ تمہارے لیے نہیں، مت جاؤ، واپس لوٹ آؤ، زندگی سے فرار صرف تمہارے ذہن کی اختراع ہے توڑ دو ان فرسودہ روایات کی ڈور کو، اگر جانا ہی مقصود ہی ہے تو مجھے اپنے ساتھ لے چلو—

میں یہ آواز ہر روز سنتا ہوں۔ جب میں نے پہلی بار یہ آواز سنی تھی تو تمام جسم درد کے ملے جلے خوف سے پھول گیا تھا۔ میں اس قدر خوفزدہ تھا کہ اپنا جسم دہکتے ہوئے شعلوں میں ڈال دیا تھا۔

لیکن اب میں اس سے خوف تو نہیں کھاتا ہوں— ہاں یہ ضرور ہے کہ روز زندہ ہوتا ہوں اور روز مرتا ہوں اور میں ابد تک اسی طرح جیتا اور مرتا رہوں گا۔ یہ آواز مجھے ہر روز قتل کرتی ہے اور ہر روز زندگی کے ساتھ رشتہ بھی جوڑ دیتی ہے۔

ہر قدم پر اس کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ اگر تمہارا جانا اتنا ہی ضروری ہے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو— کیونکہ تم اپنے اس خوبصورت لان میں ہنستے اور کھلکھلاتے پھولوں کو دیکھتے دیکھتے زندگی کی سچائیوں کو بھلا بیٹھے ہو۔ تمہارے لیے یہ تاریک کمرہ ہی زیادہ موزوں ہے— آواز میرا پیچھا کرتی ہے، میرے اٹھتے ہوئے قدم کو روک لیتی ہے— کمرے سے باہر نکلتے ہی میں اس کا تابع ہو جاتا ہوں۔

میری ہر فکر، ہر سوچ اسی کی تابع ہو جاتی ہے۔

میں بار بار سوچتا ہوں اس آواز کو قتل کر ڈالوں۔ میری اس خواہش پر ایک قہقہہ سنائی دیتا ہے جیسے وہ آواز کچھ کہتی ہے۔ تم ابھی مجھے قتل کر نہیں سکتے۔ تم اگر قتل کرنا بھی چاہو تو تمہاری انگلیاں سکڑ کر تنگ ہو جائیں گی۔ وہ منجمد ہو کر برف کی سل بن جائیں گی۔

تمہاری ہر فکر، ہر سوچ میری تابع ہے۔ اس میں تمہاری سرتابی کی مجال نہیں۔ میں چیختا ہوں اور چیختا ہی چلا جاتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کر پاتا کیونکہ میری انگلیوں کا سارا خون جم کر انہیں پتھر بنا دیتا ہے۔ میری بے حس انگلیاں پتھر بن جاتی ہیں۔ میں اپنی سرد انگلیاں اس کی گردن میں گھسیڑ دیتا ہوں — لیکن سرد انگلیاں احساس کے بوجھوں سے پگھل جاتی ہیں۔ میں جھنجھلا کر اپنی گردن مروڑ ڈالتا ہوں۔ خون کے سفید قطرے چہرے کو گھیر لیتے ہیں۔ میں اپنے اس سفید چہرے کے ساتھ قدم آگے بڑھاتا ہوں۔ ہر قدم پر مجھے ایک آواز سنائی دیتی ہے جس کی سرگوشیاں بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ مت دیکھو ان سرخ پھولوں کو، سبز لتاؤں کو، چلو میں تمہیں زندگی کی جیتی جاگتی اور سچی تصویریں دکھلاؤں جنہیں دیکھ کر تم دنیا کی حقیقت کو سمجھ سکو گے۔ ورنہ یونہی تمام عمر دھوکا کھاتے رہو گے۔ بے خواب کواڑ تمہیں اندر نہیں پہنچنے دیں گے۔ تمہاری خواہش یونہی دم توڑتی رہے گی۔ تمہاری ہر آرزو، ہر تمنا اپنا ہی گلا گھونٹتی رہے گی۔

آؤ — میرے ساتھ آؤ — اگر نہیں تو واپس اپنے کمرے میں چلو۔ میں تمہیں تنہا آگے نہیں جانے دوں گی۔ میں تمہاری دوست ہوں۔ مت خوف کھاؤ — میرے وجود سے — اگر جانا ہی مقصود ہے تو لاؤ دے دو تم اپنے احساس کی دولت —

میں اس آواز کے ساتھ لان سے باہر آ جاتا ہوں۔ میرے سامنے تارکول کی کالی سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی دکھائی دیتی ہے۔ مجھے یہ سڑک حقیقتاً سانپ لگتی ہے۔ میرا جو قدم اُس پر پڑتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے قدموں کے نیچے کوئی دلدل آ گئی ہے۔ میں اس میں دھنستا جاتا ہوں۔ میں چیخنا چاہتا ہوں اور واپس اپنے کمرے میں آ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ آواز مجھے بھاگنے نہیں دیتی، مجھے ڈھکیلتی رہتی ہے۔ میں بے جان پتھر کی طرح آگے لڑھکتا رہتا ہوں۔

میری ہر فکر، ہر سوچ مفلوج ہو جاتی ہے۔ میں خود نہیں سوچتا — ہر عمل اسی آواز پا کے اشارے پر تکمیل پاتا ہے۔ میں خود ایک ایسے حصار میں مقید ہو جاتا ہوں جہاں سے چھٹکارا میرے ناتواں جسم کے لیے ناممکن ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میرے لیے وہ کمرہ ہی عافیت کی جگہ ہے جہاں میں سوچ سکتا ہوں، لکھ

سکتا ہوں، پڑھ سکتا ہوں، گا سکتا ہوں — لیکن باہر آکر جیسے میں ایک موی لاش کی طرح آواز کے کاندھے پر سوار چلتا رہتا ہوں۔

وہ آواز میری مجبوری ولاچاری پر قہقہہ لگاتی ہے۔ میرے جسم کے تمام حصوں پر انگلیاں پیوست کرتی رہتی ہے۔ میں ایک ٹوٹے پتے کی طرح ہواؤں میں ڈولتا رہتا ہوں۔ جیسے میرا وجود ہی نہ ہو۔ میں صرف ایک بگولہ ہوں، کسی صحرا میں اڑتا پھرتا ہوں۔

میں ہر لمحہ واپس لوٹ جانے کی خواہش کا اعادہ کرتا ہوں لیکن وہی آواز پا میری زبان پہ انگلیاں چبھو دیتی ہے۔ خون کی زرد لکیریں میرے تمام چہرے پر پھیل جاتی ہیں۔ میں ان لکیروں کو شمار کرنے کے لیے جب بھی انگلیاں اوپر لے جاتا ہوں، وہ انگلیاں معلق ہو کر ٹنگی رہ جاتی ہیں۔

میں سڑک کے ایک موڑ پر پہنچ جاتا ہوں۔ میری زبان خون سے سرخ ہو جاتی ہے۔ میں خون کی ایک پچکاری سڑک کی کالی پیٹھ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ خون برابر رستا رہتا ہے — اور میں تھوکتا رہتا ہوں یہاں تک کہ زبان خشک ہو کر اندر کو سمٹ جاتی ہے —

میں جب بھی روشنی دیکھنا چاہتا ہوں، وہ آواز اپنی ہتھیلی میری آنکھوں پر رکھ دیتی ہے۔ جیسے کوئی پتھر، کوئی گرم لوہے کی سل۔ میں صرف اس ہتھیلی کی لکیریں دیکھ سکتا ہوں جو خطرناک کیڑوں کی طرح میری آنکھوں میں رینگتے رہتے ہیں۔ اُن کی سرسراہٹ سے میں بے ہوش ہو جاتا ہوں۔

وہ آواز مجھے اٹھا کر ایک ایسی جگہ لے جاتی ہے اور کہتی ہے اب دیکھو! ان چہروں کو دیکھو — تمہیں یہاں سچائی ملے گی۔ اُن کی زرد اور جذبات سے عاری آنکھوں کو دیکھو — جس میں کوئی خواہش، کوئی تمنا نہیں، صرف اس میں تمہاری امید کی لاشیں ہیں — یہی زندگی کی سچی تصویریں ہیں۔

میں اپنی آنکھیں بند کر لینا چاہتا ہوں اور چیخنے کی خواہش کرتا ہوں۔ میری آنکھیں ان تصویروں کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتیں۔ میں بے تحاشہ دوڑنے لگتا ہوں، بے تحاشہ چیخنے لگتا ہوں۔ میں اُس آواز کو روندتا پچھاڑتا اپنے کمرے کی طرف بھاگنے لگتا ہوں اور یہاں تک کہ میں اپنے کمرے میں گر کر ہانپنے لگتا ہوں — اور باہر آواز قہقہہ لگاتی رہتی ہے — میں بے پرواہ ہو کر ایک گلاس پانی پیتا ہوں اور کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں اور اپنا جسم ٹٹولتے ہوئے باتھ روم میں داخل ہو جاتا ہوں۔

—————۱۹۶۹ء

فریم

میں نے چونک کر دیکھا کوئی نہیں تھا، میرے بدن کے نیچے ایک پیلی زمین تھی، ایک طرف نشیب تھا جو مقابل سے پشت تک پھیلا ہوا تھا۔ دوسری طرف دائیں بائیں دو اُبھرے نقطے تھے۔

میں نے پیروں کو سیدھا کرتے ہوئے آواز کی طرف توجہ دی جو ابھی ابھی اُبھری تھی۔ دوسری طرف منھ کر کے سگریٹ جلائی اور ماچس کی تیلی دور ہوا میں اُچھال دی۔ اس کے اُچھالنے میں میرا بدن زمین کی پشت سے ٹکرایا، اُٹھا اور جھک گیا۔

توازن بگڑا، میز سے ٹکرایا، گلاس ٹوٹ کر زمین کو گیلا کر گیا۔ میں اس سچویشن کے لیے ابھی تیار نہیں تھا، صرف انگلیاں توڑی تھیں، آنکھیں کھولی تھیں، دور جانا تھا۔۔۔

قد آدم آئینہ میں ایک منظر تھا، یقین نہ آتا تھا، آنکھیں کھولیں، سمجھنے کی کوشش کی۔

منظر کیا تھا، ایک دریا تھا، چیخیں مار رہا تھا، دوڑ رہا تھا، ٹیلے خوفزدہ تھے۔۔۔ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ درختوں نے زاویے بدل لیے تھے۔ آس پاس کی سیاہ اور جھلسی جھاڑیاں نرم پڑ گئی تھیں۔ کشتی کا اوپری حصہ ڈوبا ہوا تھا۔ آدمی کا صرف دایاں ہاتھ دکھائی دے رہا تھا۔

میں اس کلیہ کا حل ڈھونڈنے کے لیے زمین کو پرے کھسکا کر نیچے اُترا۔ میرے جوتے میں فیتے

نہیں تھے۔ فرش خالی تھا۔ ایک موٹے چوہے کی مشکیں اسی فیتے سے بندھی ہوئی تھیں۔ دو چمکیلی آنکھیں گھور رہی تھیں۔

چھڑی اُٹھائی، چھوٹ کر دور جا پڑی، سگریٹ کا پیکٹ بکھر گیا تھا۔ کئی سگریٹیں غائب تھیں۔

اس جگہ اب بھی اندھیرا تھا۔ اُس اندھیرے میں زمین نے پھر کروٹ لی تھی، پشت پر ہاتھ ڈالا اور زمین کو کیلی کے بائیں جانب گھما کر میں دائیں سے مڑ کر سامنے آیا اور نیچے بیٹھ کر فیتہ، سگریٹ، چھڑی اور ماچس کی ڈبیا تلاش کرنے لگا۔

ایک زور کی چھینک آئی، پردہ ہلا— پردے کے باہر جھانک کر دیکھا کوئی سایہ جو کئی گز لمبا تھا، کھڑکی سے اندر رینگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ کافی اندر تک رینگ چکا تو میں نے جوتے کے فیتے سے اس کی مشکیں باندھ دیں۔ دو سیاہ آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں، چھڑی نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی، پردہ برابر ہو گیا تھا—

دریا ابھی تک خاموش نہیں ہوا تھا۔ کشتی ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس ہچکولے میں ادھ بھری بالٹی اُلٹ گئی تھی۔ دو پیاسی آنکھیں اس دودھ کو دیکھ رہی تھیں۔ گلاس کی ٹوٹی کرچیں، سگریٹ کے خالی ڈبے، ماچس کی جلی تیلیاں تیر رہی تھیں۔

زمین پر سفید چادر کھینچ کر میز کے قریب پہنچا، گلاس میں دودھ جم گیا تھا۔ سیاہ نقطے اس کے نیچے اور آس پاس اکٹھا ہو گئے تھے۔ ایک تیسری حس نے انہیں بکھیر دیا تھا۔

نقطے پھر گلاس کے نزدیک آ گئے تھے۔ پیاسی آنکھوں نے دودھ کا ذائقہ چکھ کر سیاہ چلمنیں گرا لی تھیں۔

آئینے میں اب بھی وہی منظر تھا— سورج نے پردہ اُٹھا دیا تھا۔ ہوا بھی بند ہو گئی تھی۔ دریا ٹھہر گیا تھا، ٹیلے اپنی جگہ واپس لوٹ آئے تھے۔ درختوں کا زاویہ صحیح ہو گیا تھا۔ جھاڑیوں نے سر جھکا دیئے تھے۔ ہر شئے ٹھیک تھی صرف فریم ترچھا تھا—

———— ۱۹۷۲ء

دولت پور کا آخری نواب

دولت پور اَودھ کا ایک انتہائی مردم خیز خطہ تھا۔ استبداد زمانہ نے اس کی بھی بساط الٹ دی تھی۔ بڑے بڑے علما وفضلا، ادیب وشاعر اس خاک سے اُٹھے اور اسی خاک کے پیوند بن گئے۔ جانے کتنے درِ شہوار آج گمنامی میں محو خواب ہیں۔ شعر وسخن کی محفلیں اس طرح ختم ہوگئی ہیں جیسے یہاں پہلے کبھی شعر وسخن کی نغمہ سنجی سے فضا آشنا نہ تھی۔ ایک سے ایک معرکۂ آرا مشاعرے ہوئے جس میں بڑے بڑے نامور شعرا شریک ہوتے رہے ہیں۔ یہیں ایک نواب اعتبار الدولہ سر اقتدار علی خاں خان بہادر بڑے ہی پائے کے بزرگ گزرے ہیں۔ انتہائی خلیق، متواضع اور وضعدار تھے۔ ان کی خلق پروری، انسان دوستی ضرب المثل کا درجہ رکھتی تھی۔ علم نجوم وجفر سے بھی کما حقہ آگاہی تھی۔ فارسی، اردو، عربی تو ان کے مزاج میں رچی بسی ہی ہوئی تھی دوسری ملکی اور غیر ملکی زبانوں پر قدرتِ کاملہ حاصل تھی۔ اردو و فارسی کے جید عالم اور نبض شناس شاعر تھے۔ جانے کتنے شعرا کی سرپرستی انہوں نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ ان کے علاوہ مرزا طفیل علی، حمزہ، خواجہ نغز علی نغز، بشارت حسین تفتہ، منشی خیر الدین احقر جیسے نامی وگرامی شعرا ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کے علاوہ قصبہ کے دوسرے علما اور بزرگوں میں منشی ظہور علی، مرزا اسلام بیگ کاشانی، نواب حمایت علی شاعر، منشی افتخار حسین حیدر، مولوی ابوالفتح، شیخ سبحان میاں وغیرہ نے اس قصبہ کو چار چاند

لگا رکھے تھے۔

قصبہ کیا تھا شیراز تھا۔ شاید انہیں قصبوں کے لیے شاہجہاں نے کہا تھا:

پورب شیراز مملکت ما است

صوفی اور ادیب و شعراء کے علاوہ اس قصبہ نے جنگ آزادی کے سورما بھی پیدا کیے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال نے اس قصبہ میں رنج و غم کی فضا بھی پیدا کی تھی۔ جب انگریزوں کی شاطرانہ چالیں عہد مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیجا اور ان کے بیٹوں کے سر قلم کیے تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس قصبہ کے ہر شخص نے جام شہادت نوش کر لیا ہو۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی نے اس قصبہ کو بھی جبر و استبداد کا نشانہ بنایا۔ جانے کتنے علما تختۂ دار پر لٹکا دیے گئے۔ جانے کتنوں نے دولت پور کو چھوڑ چھوڑ کر ادھر ادھر روپوشی اختیار کرنے لگے۔ نواب اقتدار علی خاں نے اپنی ریاست کی فلاح و بہبود کے لیے انگریزوں سے صلح صفائی کرنے کے لیے مجبور ہوئے۔ شاہان اودھ سے منسلک ہونے کی وجہ سے دولت پور کی آبرو پوری طرح نہیں تاراج ہوئی۔ لیکن ایک ایسا زخم ضرور لگا تھا کہ برسوں اس کے در و دیوار سے آہ و شیون کے نالے بلند ہوتے رہے۔ وہی محفل جو شعر و سخن کے نغموں سے گونج رہی تھی، نالہ و شیون میں ڈوب گئی۔

نواب صاحب انتہائی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ انہوں نے وقت کی نبض پہچان کر قصبہ کو آنے والے آفات سے ہی نہیں بچایا، جانے کتنوں کی جانیں بچائیں۔ ان کے اسی فلاحی روش نے ہر ایک کو ان کا انتہائی معتقد بنا دیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انہوں نے عوام کے ساتھ غداری کی تھی۔ انگریزوں کی چاپلوسی کی تھی۔ انہوں نے بھی پوری طرح جنگ آزادی کے متوالوں کو ہر طرح کی امداد بہم پہنچائی تھی۔ خود ان کے خاندان کے جانے کتنے لوگوں نے جنگ آزادی میں اپنا خون بہایا تھا۔ انہوں نے خاندان کے کسی فرد کی آزادی کا گلا نہیں گھونٹا تھا۔ خود بظاہر غیر جانب دار رہے لیکن اندرونی طور پر وہ آزادی کے جنگی سورماؤں کو پناہیں دیں اور ان کی جان بخشوائی۔

اودھ ابھی تک لوگوں کا ملجا و ماوی بنا ہوا تھا لیکن کب تک ــــــ بیگم حضرت محل کی جرأت مندانہ قیادت نے بھی ہندوستان کی آزادی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے ــــــ

پھر بھی ایک دور ختم ہو چکا تھا اور ایک نئے دور کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ مسلمانوں میں احساس کمتری کا جذبہ پوری طرح سرایت کر گیا تھا۔ سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لینے میں نجات جانی

تھی۔ مسلمانوں کو وقت سے مصلحت کرنی پڑی اور اپنی بچی کھچی تہذیب کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے علم و ادب کی شمعیں روشن کیں۔ تعلیم کا رجحان بڑھا تو قصبہ کے جانے کتنوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ پہنچنے لگے۔ سرسید احمد کی تحریک نے مسلمانوں کے دلوں سے احساسِ ناامیدی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انہیں راغب کیا۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ انہیں علم کی قدر و قیمت بتلائی، انگریزی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ سائنس کی تعلیم کی طرف نوجوانوں کو بلایا۔ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اسباب بغاوت ہند لکھ کر انگریزوں کی نفرت کم کی۔

ادھر آزادؔ اور حالیؔ نے زبان و ادب کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ نئی روشنی اور نئی آواز کی گونج پیدا کی۔ شعر و ادب میں نئے صحیفے لکھے گئے۔

ان سب میں نواب صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سرسید کی رفاقت میں عوام کی فلاح و بہود، تعلیم و تربیت کے اہم کاموں میں حصہ لیا۔

اس نئی روشنی کو قبول کرتے ہوئے نوجوانانِ قصبہ نے اعلیٰ عہدے حاصل کیے۔ عزت و شہرت نے دولت پور کو اودھ میں ایک الگ مقام دلایا۔

نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں اور پوتوں نے اپنے آبا کے لگائے پودے کی شادابی کم نہ ہونے دی۔

ہندوستان تقسیم ہوا۔ ایک بار پھر مسلمانوں میں انتشار پھیلا۔ خاندان بٹے، زبان بٹی، تہذیب بٹی جانے کیا کچھ تقسیم ہوا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان نے ہندوستان چھوڑ کر پاکستان کی راہ لی۔ دولت پور کی تہذیب جانے لگی تو دولت پور کے خاموش در و دیوار نے ان کے دامن کھینچے، آنسو بہائے لیکن ان بڑے محلوں کی زندگی کی رونق ختم ہونے کے دن آچکے تھے۔ ایک ایک کر کے لوگوں نے نئے ملک میں اپنی قسمت آزمائی کرنے کے لیے نکل پڑے۔

دولت پور ویران ہو گیا۔ محلوں کے در و دیوار خاموش ہوئے۔ نغمے روٹھ گئے۔ بہاریں رخصت ہو گئیں۔ اس کی بچی آبرو کو موجودہ سیاست نے ختم کر دی۔ اب کیا تھا ایک ایک کر کے محلات کھنڈر ہونے لگے۔ کون تھا جو ان کی دیکھ ریکھ کرتا۔ کون تھا جو ان اوراق پارینہ کی پھر شیرازہ بندی کرتا۔

صرف نواب صاحب کا گھر تھا۔ تنہا نواب صاحب تھے جنہوں نے دولت پور کو نہ چھوڑا تھا۔ صرف ان کی بیٹی تھی جو اب بیوہ ہو چکی تھیں۔ انہوں نے بیمار باپ کو چھوڑ کر اپنے بیٹوں کے ساتھ پاکستان

جانا قبول نہ کیا۔

دولت پور کے کھنڈرات پکار پکار کر اپنی گذشتہ عظمت کا اعلان کر رہے تھے۔

یہ انقلاب زمانہ ہی تو ہے کہ جس گھر پر ہاتھی جھومتے تھے، محفلیں بجتی تھیں، اب وہاں دھول اڑتی ہیں۔ سیاہ اور کھردری دیواریں اپنی برہنگی پر کفِ افسوس ملتی ہیں۔

رات بے حد تاریک تھی۔ نواب مجید مسہری پر لیٹے زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ پاس ہی اُن کی چہیتی بیٹی اپنے میلے آنچل سے آنسو پوچھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

نواب مجید کراہ کر بولے — ارجمند! جاؤ آرام کرو۔ رات کافی گزر چکی ہے۔ میں تو چراغ سحری ہوں کب بجھ جاؤں، ہاں تمہارا غم ہے جو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔

ارجمند بانو نے ایک سسکی لی اور دروازے کی طرف ایک آس بھری نگاہ ڈالی۔ نواب امجد کی نگاہیں بھی اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔

حسن آیا کہ نہیں — انہوں نے پوچھا۔

جواب نفی میں پاکر وہ ایک بار پھر متفکر ہو گئے۔ حسن اُن کا پوتا تھا جو پاکستان میں ایک بڑے عہدہ پر ملازم تھا۔ وہ اپنی ارجمند کا لختِ جگر — جو انہیں لینے آیا تھا۔ لیکن ہندو پاک کی جنگ نے اُسے ہندوستان میں مسحور کر دیا تھا۔ نواب امجد پریشان تھے۔ پولیس کی سخت آزمائشوں نے انہیں مایوس کر دیا تھا۔ وہ بڑی بے تابی کے ساتھ اس کی آمد کے منتظر تھے — کہ وہ اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ''ناکامی'' دیکھ کر نواب امجد آنسو نہ روک سکے۔

حسن میں تو چند دنوں کا مہمان ہوں۔ میں ارجمند کو کس کے سہارے چھوڑ کر جاؤں گا۔ کاش یہ جنگ نہ چھڑ جاتی تو میں انہیں تمہارے ساتھ ان کو ضرور بھیج دیتا۔ میں جب اس وقت نہ گیا جب قویٰ مضبوط تھے تو اب میں کیا جاتا۔ لیکن تم سب لوگوں کی خواہش پر دل نہ چاہتے ہوئے حامی بھر لی تھی۔ مگر اس جنگ نے شاید مجھے روک لیا ہے۔ میری خاک یہیں کی ہے۔

جنگ بند ہو چکی تھی اور ایک نیا ملک بھی وجود میں آچکا تھا۔ پاکستان کی وحدت تقسیم ہو چکی تھی اور نواب امجد بھی جیسے تقسیم ہو چکے تھے۔ وہ ہندوستان دوست تھے۔ ان کی حب الوطنی ہی تھی جس کے سبب ہندوستان کی حکومت نے حسن کو پاکستان جانے کی اجازت دے دی تھی — لیکن ارجمند پھر بھی اپنے بیٹے کے ساتھ نہ جا سکیں۔ وہ ایک بار پھر رک گئی تھیں جیسے ان کی آرزو کو فتح ہوئی ہو۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں

بوڑھے باپ کو چھوڑ کر جاؤں۔

حسن ابھی دولت پور کی سرحد سے پار ہوا تھا کہ نواب امجد کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ وہ اپنے دادا کو اس حال میں چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ تھا لیکن اُسے جانے کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ ہائے کتنی مجبوری ہندوستان کی تقسیم نے کتنے مسائل کھڑے کر دیے تھے۔ انگریزوں کی شاطرانہ چالیں ہندوستان چھوڑتے چھوڑتے آگ لگا ہی گئی تھیں۔

نواب امجد سوچتے کاش یہ تقسیم عمل میں نہ آئی ہوتی۔ کاش باپ بیٹوں، بھائی بہنوں، عزیز اور دوستوں کا پیار،ان کی محبت تقسیم نہ ہوتی۔

لیکن وقت کب یہ سوچتا ہے وہ اپنا کام کر جاتا ہے۔ زخم مندمل ہو جاتا ہے لیکن اپنا نشان تو چھوڑ ہی جاتا ہے۔

حسن ابھی ہندوستان ہی میں تھا کہ موت کا فرشتہ دولت پور میں نواب کی کوٹھی کے گرد پہنچ چکا تھا۔

شبنم نے اپنے تمام آنسو زمین پر بکھیر دیئے تھے۔ فضا بے حد اداس ہو گئی تھی۔ لوبان کی خوشبو نے ماحول کو اور زیادہ کربناک بنا دیا تھا۔

نواب امجد کی آخری خواہش پوری ہو چکی تھی۔ بیگم ارجمند نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اک جنازہ اُٹھ رہا تھا اور بیگم ارجمند اپنے باپ کی میت کو جاتے دیکھ رہی تھیں۔ روکنا چاہتی بھی تو نہ روک پاتیں۔ ایک ایسا صدمہ تھا جس نے انہیں زندہ درگور کر دیا تھا۔ ایک سایہ لہرایا، وہ خود لہرائیں جیسے وہ خود بھی اپنے باپ کے ساتھ روانہ ہو چکی ہوں——

——— ۱۹۷۰ء

دردِ دل

اس نے دریچہ وا کر کے پائیں باغ کی طرف دیکھا— وہاں کیاریوں میں گلاب کے پودے ملول سے تھے— اُس پر اُن کے آنسوؤں کے نقش سورج کی روشنی میں عیاں تھے— ایک بھونرا پروانہ وار اس کے گرد منڈلا رہا تھا— اس کی آنکھوں میں آنسو کپکپا اُٹھے— وہ سسک اُٹھا— اپنے ہاتھ کو اُس نے اپنے ہونٹوں پر رکھ لیے— تا کہ اندر سے اُٹھتی ہوئی کڑواہٹ نہاں خانۂ دل میں ہی سسک کر رہ جائے—

اے خدا— میں جانتا ہوں تو بچے کی طرح شوخ بھی ہے۔ کیا زمین، کیا فلک ہر جگہ تیری شوخی ہے، بے قراری ہے— جو چیزیں تو ایک وسیع، معجز امید کے ساتھ اور لامحدود، بہترین خیال کے ساتھ تعمیر کرتا ہے انہیں بھی ایک لمحہ میں نہایت بے جگری سے منہدم کر دیتا ہے۔ جن دنوں کے خوشی کے پر لگے ہوں وہ بہت سرعت کے ساتھ اڑتے اور گزرتے ہیں۔ مردِ معبود— اور سال اپنے تتمہ کے قریب مسرتوں کی بے خودی سے مدہوش ہو جاتا ہے— رحم فرما میرے خدا— مرے دروں وہی سوز و گداز ہے جو کہ خاموش اور سوئی ہوئی بجلیوں میں پایا جاتا ہے— جو راکھ کے اندر پوشیدہ، انگارے میں ہوتا ہے—

آہ—

آج اُسے اپنا وطن یاد آرہا تھا۔ جہاں وہ آٹھ سال پہلے یونیورسٹی کا طالب علم تھا—ان دس سالوں میں اُس نے کتنے نشیب و فراز دیکھے ہیں— بینک کی نوکری میں اپنے قیمتی وقت صرف کیے ہیں— مگر— مگر—

اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہو—

جلیس—

کون— تم انجم—

وہ اس کے قریب آئی۔

جلیس نے خاموشی سے دیکھا۔

آپ کچھ چھپانا چاہتے ہیں—

انجم— تم کیوں آئی ہو— مجھے اور کیوں رُلانا چاہتی ہو— جاؤ— مجھے زندہ رہنے دو— خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو— مجھ غریب کلرک کو محبت بھی تو نہیں آتی— یہ حق تو صرف دولت مندوں کو حاصل ہے— جہاں محبت بھی ترازو پر تولی جاتی ہے— ہم تو صرف زخموں سے محبت کرتے ہیں— انگاروں سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کو میرے پاس سوائے آنسوؤں کے قندیلوں کے اور کیا ملے گا انجم صاحبہ—

آپ بے حد خفا ہیں— انجم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ مجھے کن گناہوں کی سزا دے رہے ہیں آپ، آپ غم کی اتنی شدت کو اتنا کیوں محسوس کرتے ہیں— غم بیماری ہے جو آپ کو جلا کر خاک کر دے گی۔ آپ کو ہر روشنی بھی فراڈ نظر آتی ہے۔ ہر غلطی— ہر بھول کا اعتراف بھی آپ کی نظر میں دھوکا ہے، فریب ہے— کاش آپ زندگی کے اس پہلو پر بھی غور کرتے جہاں مجبوری و بے چارگی کی آہنی دیواریں بھی ہیں— جہاں روشنی سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے۔ کاش آپ نے زندگی کے اس رخ کو بھی دیکھا ہوتا جہاں امید ہے اور شبنمی ٹھنڈک بھی ہے۔

آپ کیوں جذباتی ہو گئیں— آپ کی نظر میں غم کی کیا قیمت— غم تو ہمارے حصہ میں آیا ہے۔ ہم نے جب بھی خوشیاں چاہیں، وقت کے ناگ نے ڈس لیا— میری خوشیاں— یہ لمحاتی خوشیاں کب راس آئی ہیں— یہ ابتدا ہے۔ اس غم کی جہاں مایوسی، بے چارگی، آزردگی اور بے بسی کے خارزار کانٹے ہیں۔

بہت خوب — آپ ابھی تک فلسفۂ غم کی گتھیاں سلجھا رہے ہیں اور دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے۔ عزم و حوصلہ اور امید کا دامن تھامیے — خوشی آپ کے قدموں پر ہوگی — جلیس صاحب۔ وہ گویا ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ہلکا سا اشارہ تھا — کب ٹوٹیں کب بکھریں —

آپ —

انجم — کون تھا جس نے مجھے فریب نہیں دیا — کس نے میرا سکون نہیں چھینا — حادثہ جو قدم قدم پر چوٹ دیتا رہا ہے — انجم میں نے ہر خوشی کا گلا گھونٹنا چاہا تھا — اب تو میں ہر انجانے خوف سے کانپ جاتا ہوں۔ جب میں نے روشنی چاہی تیرگی ملی — ہر خوشی کہانی بن کر داد طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔

انجم رو پڑی — اس کی آنکھیں ساون کی گھٹا بن کر برسیں۔ وہ بولی — تم بہت خفا ہو مجھ سے — تم مجھے جتنا چاہو سنا لو — میں کب برا مانوں گی — میں بے وفا تھی، تمہاری محبت کی قدر نہیں کی — لیکن جب میں نے تم سے پہلی محبت کی دہائی دی تو تم نے اپنا دامن کھینچ لیا — میں یقیناً ذمہ دار ہوں تمہاری اس ناکامی، نامرادی اور مایوسی کی — مجھے تم سے معافی مانگنی چاہیے تھی — میں اس وقت خوابوں میں بہہ گئی تھی — میں نے خشک ندی کو خوش رو چشمہ جانا تھا — میں دنیاوی چمک دمک پر ریجھ گئی تھی — میں نے تمہیں بھلا دیا — اور پھر اس بھلانے کی سزا بھی پالی —

میں نے تمہیں بے چینی اور کرب بخشا ہے۔ میں اب اُسے واپس لینے آئی ہوں۔ تم اپنے دکھ مجھے دے دو — میں اس دکھ کو سینے سے لگا کر رکھوں گی —

میرے جلیس تم مجھے معاف کر دو —

میں نے تمہیں خوشی دے کر خوشی چھین لی تھی — میں نے تمہیں راستہ دکھا کر کہیں اور بھٹک گئی تھی — تم کبھی کہا کرتے تھے — میں تمام عمر تمہاری سیاہ آنکھوں میں بہار کی اُمڈی گھٹائیں دیکھوں گا — تم میرے لیے گل رعنا ہو، شبنم ہو، ناہید ہو، جوہی کے گجروں میں لپٹی ہوئی دلہن ہو —

جلیسؔ نے نم دیدہ آنکھیں اُٹھا کر دیکھا — انجم کی ان خوبصورت آنکھوں میں درد کی لہریں تھیں۔

انجم — تم اب تک کہاں تھیں — میں تمہیں بھول چکا ہوں — مجھے اب اور دھوکا نہ دو — جاؤ — مجھے میرے حال پر چھوڑ دو — جب میں مرجاؤں تو جی چاہے تو دعائے خیر پڑھ دینا — آوازیں اُبھریں — اور ابھرتی گئیں —

جلیس کی یہ رات بڑی گراں بار اور محرومیوں سے بھری ہوئی تھی — یہ چاند ستاروں کی دنیا اس کے لیے تازیانہ بن گئی تھی — یہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی ہوائیں زہر آلود ہوگئی تھیں۔ رات کی بے چینی اس کی پیشانی سے ظاہر تھی۔

انہی خیالوں نے اس کا پس ماندہ سکون بھی کھو دیا تھا — دنیا کی ہر شئے بے وفا تھی۔ کسی نے اس سے سمجھوتہ نہ کیا — اُس کی سب سے بڑی ٹریجڈی کہ ہر ہر قدم پر اسے ٹھوکر ملی تھی — اس کی بہاروں پر پت جھڑوں کا احسان تھا — اس کی زندگی تلخیوں کا مجموعہ تھی۔ چاروں طرف اسے اندھیرا نظر آتا تھا — اندھیرا اس کے آگے تھا۔ اندھیرا اس کے پیچھے تھا۔ اس کی زندگی کے افق کی شفق، گلنار بادلوں کی جھالریں چاند کی کرنوں کا ارتعاش، ستاروں کی درخشندگی، سب محو ہوگئی تھیں — اندھیرا اس کے نیچے تھا، اندھیرا اس کے اوپر تھا — اندھیرا — اندھیرا — اندھیرا —

ٹرین چھوٹنے میں دس منٹ باقی تھے۔ وہ اب انجم سے سامنا کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ اُس نے انجم سے انصاف نہیں کیا۔ وہ آئی — اُسے اپنی غلطی کا احساس تھا — اسے اس طرح بے اعتنائی نہیں برتنی چاہیے تھی —

کہیں وہ شدتِ غم سے کچھ کر نہ بیٹھے — اسے اتنا سنگ دل نہیں ہونا چاہیے تھا — اس کے منہ سے ایک سرد آہ نکل گئی —

وہ اس سے ملنے جا رہا تھا — اسے اپنا لینے کے لیے — کوسوں دور تک نیند کا پتہ نہ تھا۔

وہ سوچ رہا تھا

بیتے ہوئے خوشگوار دنوں کو

وہ سوچتا رہا

اور یاد کی شمعیں جلتی رہیں۔ پاک وطن سے آنے والی ہوائیں اپنے ساتھ بہت کچھ لائیں۔ پھول کی خوشبوئیں، نظموں کی لرزشیں، شبنمی شامیں، گداز چیخیں۔

وہ سرمئی شامیں آج نیزے کی انی کی طرح سینہ میں چبھ رہی تھیں — مکمل سکون، کوئی آواز نہیں، کوئی خوشبو کوئی آہٹ نہیں۔

صرف یادیں، یادیں

اف دماغ پھٹ جائے گا

یہ درودیوار گرجائیں گے، سب خوشبوئیں اڑ جائیں گی۔ کون اُسے روک سکے گا—

جانے کب تک وہ یونہی سوچتا رہا۔

یہاں تک کہ خواب کی وادی میں پہنچ گیا۔

وہ انجم سے ۶ سال بعد ملنے جارہا تھا۔ ۲ ماہ قبل کی بے اعتنائی اُسے افسوسناک معلوم ہورہی تھی۔

وہ اُسے خاموش جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا۔

انجم—

میں آگیا ہوں

پہچانتی ہیں مجھے— دردیلی آواز میں کراہا۔

انجم آج میں بہت خوش ہوں۔ میں نے تمہیں نظر انداز کیا۔

دل کی آنکھیں آنسوؤں سے چمک اٹھیں۔

وہ بولتا رہا اور انجم سسکیاں لیتی رہی

اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ چکا تھا، وہ بھبک اُٹھی

اس نے آہستہ روی سے انجم کے آنسو پونچھے

انجم مجھے تم معاف کردو۔ وہ اس کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے بولا۔

انجم رو پڑی— اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

وہ بولی— تم بہت خفا ہو—

جلیسؔ

میں نے تمہیں دل کی عمیق گہرائیوں سے چاہا تھا۔ لیکن حالات نے ایسی کروٹ لی کہ مجھے بے وفائی کا طعنہ سننا پڑا۔ یہ تمہاری بدنصیبی نہیں میری بدنصیبی ہے کہ جب آج ہم تم ایک ہو رہے ہیں، میری نبض ہستی معدوم ہورہی ہے۔ میں اس جگہ جارہی ہوں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔ میرے جلیس مجھے معاف کردو۔

میں بے وفا ہوں، ظالم ہوں، بے درد ہوں—

وہ چیخ پڑی۔

میں نے تم سے معافی مانگی تھی اپنے گناہوں کی لیکن تم نے ایسی سزا دے دی کہ میں اپنے

گناہوں کے بوجھ سے اس قدر دب گئی ہوں کہ اب سر اُٹھانے کی بھی مہلت نہیں ــــ

کاش تم نے میرے گناہوں کی اتنا بڑی سزا نہ دی ہوتی ــــ خیر ــــ میں اب سکون سے موت کو گلے لگا سکوں گی ــــ

انجم ــــ

جلیس بے قابو ہو گیا تھا۔ آنسوؤں کا تار بندھتے بندھتے طوفان بن گیا تھا۔ ایک ایسا طوفان جس میں سارا سکون، سارا اطمینان بہہ گیا تھا۔

اُس نے انجم کے سینہ پر سر رکھ دیا۔

بہار روٹھ گئی تھی ــــ

ــــــــــــ ۱۹۶۵ء

لکیر، نقطے اور دائرے

اس کی ٹانگیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ دانت باہر تھے، آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں نے کنکر پھینکا، اُس نے گھور کر دیکھا، ایک انگڑائی لیتے ہوئے اُٹھا، پھٹ پھٹ کی آواز ہوئی، اگلی ٹانگوں پر زور دیتے ہوئے پچھلی ٹانگیں پیچھے تک پھیلا دیں، میں ہنسا اور آگے بڑھ گیا—

ابھی چند گز ہی گیا تھا کہ اس کی چونچ زمین کھود رہی تھی۔ چاروں طرف میلی اور گیلی مٹی پر اُس کے قدموں کے نشان تھے۔ مجھے دیکھ کر قلانچیں ماریں اور دور جا بیٹھی۔

زمین سے کاغذ کا ایک ٹکڑا اُٹھایا، جیب سے رومال نکالا، رومال پر سیاہ دھبے تھے— تین چلتے میری طرف آرہے تھے، دو آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں، چار آنکھیں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں— ٹرن— ٹرن— میں نے کاغذ کے ٹکڑے ہوا میں اُچھال دیئے، ایک ٹکڑا اُن آنکھوں کی گود میں جا گرا۔

میں نادم ہوکر ایک پتلی گلی میں مڑ گیا۔ مڑتے ہوئے میں ایک چلتے پتھر سے ٹکرایا، پتھر رُک گیا تھا۔ دو سیاہ نقطوں میں چمک تھی، چاندنی تھی۔ میں اور گھبرایا اور اس گھبراہٹ میں ایک دُکان کے اندر گھس گیا اور دوسرے دروازے سے نکل کر کھلی سڑک پر آگیا—

سڑک پر سیلاب تھا، طوفان تھا، کئی لکیریں ایک بڑا نقطہ بنا رہی تھیں۔ اس نقطہ پر الف کھڑا تھا دو

چھوٹے الف اس کے دائیں بائیں جڑے ہوئے تھے۔ اس کے سر پر سورج تھا، سورج میں دو گہری اور سیاہ جھیلیں تھیں جن کو سیاہ پتوں نے ڈھک دیا تھا۔ جھیل کے نیچے ایک سرنگ تھی، سرنگ کے نیچے ایک راستہ تھا جن کے دونوں جانب دو پیپل کے درخت تھے۔ راستہ کے نیچے وہی گھاٹی تھی جس کے دونوں کناروں پر برف کی سلیں تھیں اور دور اندر تک پانی کی زبان تھی ـــ

دونوں چھوٹوں الف کو بڑا الف بار بار اوپر نیچے کر رہا تھا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر میلی اور گندی پوٹلی رکھی تھی جو بار بار پھول اور پچک رہی تھی۔ میں نے ایک سفید ٹکڑا اس کی طرف اُچھال دیا ـــ

آگے بڑھا، ایک حسین دائرہ دونوں بازو کھولے مجھے بلا رہا تھا ـــ میں اس کے بازوؤں کے درمیان سے گزرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

جگہ جگہ سبز ٹیلے تھے، مختلف رنگوں میں چھپی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ایک سبز ٹیلے کے سائے میں اپنا بھیگا جسم پھیلا دیا۔ دو الف دائیں بائیں اور دو لام نیچے رکھ دیے۔ ایک م دو لام کے درمیان ٹانک کر ہ کا فیتہ باندھ دیا ـــ

میں نے بائیں الف کو نقطہ کے نیچے اور دائیں الف کو نقطہ کے اوپر رکھ دیا۔

دو سیاہ کاغذ ٹیلے پر آبیٹھے۔ اُن کے ٹکڑوں نے ایک دوسرے کو پیار سے دیکھا۔

ایک پیلی اور پتلی لکیر نے الف کو چھوا۔ نون بن کر اس لکیر کو دیکھا۔ لکیر بڑی صاف اور واضح تھی۔ میں نے خوش ہو کر اس لکیر سے چند باتیں کیں اور پھر اس کو دونوں الف کے درمیان جھکا دیا۔ میں نے اس سیاہ کاغذ کو دیکھا، انہوں نے مجھے دیکھا، میں نے لکیر کو دیکھا ـــ جو چہرے پر پھیل گئی تھی ـــ

اک حادثہ تھا، لکیر گھٹ گئی تھی، مٹ گئی تھی۔ الف سورج تھا ن چاند تھا۔ لکیر ایک پھول تھی ـــ میں اندھا ہو گیا تھا، لکیر اندھی ہو گئی تھی، راستہ اندھا ہو گیا تھا ـــ فاصلہ کم تھا صرف نقطہ تھا ـــ نقطہ ''میں'' تھا ''میں'' نقطہ تھا ـــ

ـــــــــ ۱۹۷۱ء

ایک دن کی بات

سڑک کے ایک کنارے پر ایک تناور درخت اپنی خشک شاخوں کے ساتھ جھوم رہا تھا۔قریب ہی ایک ایسی کھائی تھی جس کا پانی خشک ہو کر کالا پڑ گیا تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو تھوڑی ہی دور پر ایک پلیا تھی جس پر ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا جو اپنی گائیوں اور بھینسوں کو خشک اور جھلسی گھاس سے بہلا رہا تھا۔

اس کے جسم پر کوئی لباس تھا یا نہیں، مجھے یہ معلوم کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ لیکن جسم سے لپٹی ہوئی کوئی چیز ضرور ہل رہی تھی، ہوسکتا ہے اس کا گمچھا ہو یا دھوتی کا کوئی ٹکڑا۔

لڑکے کے چہرے پر نسوانی حسن تھا لیکن چہرے پر غربت و افلاس کی وجہ سے غور و فکر کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ اس کو دیکھ کر یہ گمان گزرتا تھا جیسے وہ کوئی گوالہ ہو، کرشن کی بانسری کا دیوانہ ہو۔

ذرا دور ہٹ کر ایک بھینس ایک گڑھے کے تھوڑے سے پانی میں ڈوبنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور اُس کے پیٹھ پر ایک کالا بھجنگ کوّا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ جانے کیوں مجھے کالا کوّا دیکھ کر یہ کہاوت یاد آجاتی ہے کہ جب یہ کسی گھر کی منڈیر پر بولتا ہے تو کوئی مہمان ضرور آتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس میں صداقت ہو لیکن مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔ پھر بھی اکثر میرے ٹوٹے گھر کی مغربی دیوار کے نکڑ پر یہ بولا ضرور ہے

لیکن نہ کوئی مہمان آیا ہے نہ اس کا کوئی سندیس۔ میں اکثر اس کہاوت پر غور کرتا ہوں کہ آخر کس جذبہ کے تحت یہ کہاوت کہی گئی ہوگی۔ خیر — جو بھی ہو اس سے بحث نہیں۔ میں تو اس بھینس کو دیکھ رہا تھا جو بار بار اپنی میلی دم کو ہلا ہلا کر کوے کو اڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ کوا اڑتا اور پھر آبیٹھتا۔ اس کے اڑنے اور بیٹھنے میں رنگ کی نفسیاتی بات ہو سکتی ہے۔

دھوپ کافی تیز تھی اور مجھے ابھی کافی دور ایک گاؤں جانا تھا۔ گاؤں اسی پلیا سے لگے کچے راستے پر تھا۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد میں اس کچے راستے پر ہو لیا۔ جگہ جگہ خشک زمین کا سینہ پھٹ رہا تھا۔ لڑکا اب پلیا سے ہٹ کر پیڑ کے نیچے آبیٹھا تھا۔ میں ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک کتا تیزی سے دوڑتا ہوا میری طرف آیا، اس کے بھونکنے پر کئی ایک جانور بدک کر بھاگے، میں ایک لمحہ کے لیے رک سا گیا۔ وہ برابر بھونکتا رہا — بھوں — بھوں —

گاؤں ابھی دور تھا لیکن گھر کی چھتیں دکھائی دے رہی تھیں، دھواں نہیں اُٹھ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگ ابھی گاؤں نہیں لوٹے ہیں۔ مجھے وحشت ہو رہی تھی لیکن آگے بڑھتا ہی گیا۔ وہ کتا اب میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا کہ کہیں انجانے میں حملہ نہ کر بیٹھے۔ ہو سکتا تھا یہ کتا باولا ہو گیا ہو۔ کہتے ہیں اگر کسی شخص کو کوئی باولا کتا کاٹ لے تو وہ خود کتوں جیسی حرکتیں شروع کر دیتا ہے اور پانی دیکھتے ہی وہ خود کتے کی طرح بھونکنے لگتا ہے۔

یہ بھی کتنی عجیب بات ہے۔ میں سوچتا یہاں تک کہ اس کا سائنسی جواز کی تلاش شروع کر دیتا۔ میں اب گاؤں کے قریب آگیا تھا۔ باہر آم کے باغ میں چند لڑکے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ آم کے بوروں میں ننھے ننھے پھل لگ چکے تھے۔ یہ کچے اور ہرے ٹکوروں کی چٹنی مجھے کافی اچھی لگتی ہے۔ کھٹے اور ترش ذائقہ میں جانے کیا لذت ہوتی ہے کہ ہر ایک اس پر پتھر پھینکتا ہے۔ مجھے آتا دیکھ کر ان لڑکوں نے ایک بار اپنا کھیل روک کر مجھے دیکھا اور پھر کھیلوں میں لگ گئے۔ ایک تین سال کا گورا بچہ روتے روتے چپ سا ہو گیا۔ آخر ایسا کیوں؟ میں نے ایک لڑکے کو قریب بلا کر پوچھا کہ یہ دیال پور ہے نا؟ جواب اثبات میں پا کر میں گاؤں میں داخل ہو گیا۔

گاؤں کے سرے پر ہی ایک پکا کنواں تھا اس سے ملا ہوا مہادیو جی کا مندر۔ کنوئیں سے چند عورتیں پانی نکال رہی تھیں۔ مجھے آتا دیکھ کر گھونگھٹ کاڑھ لیا اور جانے کیا ایک دوسرے سے بولیں۔ میں نہیں سن سکا۔ کنوئیں کے پاس ہی ایک پتھر کی سل پڑی ہوئی تھی جو شاید نہانے اور کپڑا دھونے کے لیے

رکھی گئی ہے۔ کہیں گوبر کی چرائندھ بھی جھکولا دے رہی تھی۔

گاؤں کے اندر پہنچ کر میں اس آدمی کے متعلق پوچھنے کا ارادہ کیا جس سے میں ملنے کے لیے شہر سے آیا تھا۔ ایک عورت سے جو گوبر کے اوپلے تھاپ رہی تھی، میں نے اس سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا۔ میرے پوچھنے پر وہ بڑی زور سے ہنسی۔ میں اس کی ہنسی کا سبب پوچھنے ہی والا تھا کہ جیسے کچھ مجھے یاد آگیا ہو۔ میں جس شخص سے ملنے آیا تھا وہ میں خود تھا۔

۱۹۷۱ء

گلاب کی خوشبو

اُف! کمبخت یہ کانٹے — خون — ہائے اللہ خون — اس نے ایک سسکاری لی۔

کانٹا چبھو ہی لیا نا — میں نے کہا تھا نا — پھول نہ توڑیے — یہ کانٹے اُن کے محافظ ہیں۔ جلیس دور سے ہنستا ہوا بولا —

آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے اور یہاں انگلی لہولہان ہو گئی —

لایئے دیکھوں، آپ کی انگلی — اس نے نکہت کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

چلئے — آپ سے مطلب — آپ کون ہوتے ہیں، کانٹا چبھے یا ٹوٹے — اُس نے غصے سے جلیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اوہ! بہت ناراض ہو رہی ہیں آپ — خطا کس کی اور سزا کس کو — لایئے میں کانٹا نکال دوں، ورنہ —

ورنہ کیا — وہ بولی۔

ورنہ کیا — یہی کہ خدانخواستہ یہ نشتر کہیں ٹوٹ کر رہ گیا تو سدا انگلی دکھے گی۔ جلیس، نکہت کی انگلی تھامتے ہوئے بولا۔

اچھا — یہ میں نے آج جانا۔

آپ اسے کیا سمجھیں گی۔ یہ مرے دل سے پوچھو ترے تیرِ نیم کش کو —

چلئے آپ بہت برے ہیں۔ اُس نے ناراض ہوتے ہوئے ہاتھ کھینچ لیا —

جائیے — یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں۔ کوئی دیکھ لے گا تو —

تو کیا — یہی نا کہ میں کسی خوبصورت پھول کا طواف کر رہا ہوں۔ اس کے نازک اور حسین پنکھڑیوں کی ساری لطافت اپنی آنکھوں میں سمو رہا ہوں — اس کی خوشبو اس کی نکہت سمیٹ رہا ہوں —

اونہوں — کیا بکواس — میں درد سے بے تاب ہوں اور آپ کو شاعری سوجھ رہی ہے —

نکہت نے منھ بناتے ہوئے کہا۔

شاعری — آپ کو دیکھ کر شاعری نہیں کروں گا تو کیا مرثیہ پڑھوں گا۔ ویسے یہ موقع تو مرثیہ ہی پڑھنے کا ہے — اُف کتنی تکلیف ہوگی آپ کو — کتنا درد، کتنی ٹیس اُٹھ رہی ہوگی۔ کاش میں آپ کا یہ درد پی لیتا — آپ کی ان خوبصورت اور غزالی آنکھوں میں آنسو نہیں، ان میں آنسوؤں کا کیا کام، یہ تو صرف مسکرانے کے لیے ہیں — دیکھیے شبنم کے یہ موتی بھی آپ کی طرح درد و کرب میں مبتلا ہیں۔ گلاب پر جمی یہ شبنم کی بوندیں پشیماں ہیں — وہ بولتا رہا اور نکہت برابر منھ بناتی رہی —

جلیس نے بڑھ کر دوبارہ ہاتھ تھام لیا — اور جیسے ہی اس نے انگلیاں منہ کے قریب کیں — بدتمیز — نکہت نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا — اور چلنے ہی لگی تھی کہ جلیس نے راستہ روک لیا اور بولا — نکہت کیا میں اتنا برا ہوں، کیا میں تمہیں بدتمیز دکھائی دیتا ہوں، میرا ارادہ کانٹا نکالنے کا تھا۔ دانتوں سے ہونٹوں سے نہیں۔ میرا کوئی غلط ارادہ نہیں تھا — آپ کیوں خفا ہو رہی ہیں، میں نے تو چاہا تھا کہ آپ کا درد بانٹ لوں، آپ کو اس درد سے نجات دلا دوں — لائیے اپنا ہاتھ — مجھے غلط نہ سمجھئے —

جلیس اس ننھے نشتر کو اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولا۔ یہ لیجیے — یہ چھوٹا سا نشتر کیا درد دے گیا — اگر یہ رُکا رہ جاتا تو عمر بھر ٹیس دیتا رہتا —

شکریہ آپ کا — اُس نے کا پیاں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

ایک گلاس پیش کرتے ہوئے اس نے کہا۔ قبول کر لیجیے اس ناچیز کا تحفہ —

شکریہ! لائیے دیکھوں آپ کا تحفہ کتنا شاداب، کتنا خوبصورت ہے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا —

اس رات وہ ٹھیک سے سو نہ سکا اور کچھ عجیب سی خوشبوؤں کی پرچھائیاں اس کی نیند کی نازک دنیا میں لرزتی رہیں۔ ایک عجیب سی صحت افزا خوشبو اس کے جسم وجاں میں رس بس گئی تھی——

وہ محسوس کر رہا تھا جیسے نکہت کے لبوں کے پھول اس کے لیے مسکراتے ہیں، اس کی نگاہوں کی کلیاں اس کے لیے چٹکتی ہیں—— اس کے ذہن میں نکہت کا چہرا، چاند کا نور، پھولوں کی مسکراہٹ، دو خوبصورت خوبصورت ہونٹ اُبھر آئے تھے۔ اس کے ذہن میں گلاب کی پنکھڑیاں اپنا نقش چھوڑ گئی تھیں۔

وقت گزرتا گیا—— وہ آج خوابوں کے انگنت آذر کدے بنائے خیالوں میں گنگناتا رہا۔ اس نے دور گلاب کے کنج کے پاس کھڑی نکہت کو دیکھا جو ہلکے نیلگوں لباس میں ملبوس تھی۔ اس کا مسکراتا چہرا اس قدر دلفریب معلوم ہو رہا تھا جیسے چاند مغربی افق پر شفق کی آخری لکیر پر محجوب، شرمایا ہوا برآمد ہوا ہو۔ اس مہ وش ساقی کی طرح جس نے اپنے دست سیمیں میں پہلی بار مینا اٹھائی ہو۔ اس کی ٹھوڑی کی جلد ناشپاتی کی طرح بے داغ تھی، نیچے گردن اور سینے کے اتصال پر ایک گڑھا تھا جس پر ایک رگ تڑپ رہی تھی۔ اس کا چہرا سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی برہنہ بانہیں بے حد خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔

نکہت—— اس کی آواز میں لرزش تھی۔

جی—— ایک شیریں نغمہ گونجا۔ جیسے کوئی کلی چٹکی ہو، پتوں کا جھومر ہوا میں ہلا ہو۔ اُس نے بڑھ کر آغوش وا کر دی تھی——

لیکن—— یکا یک ایک روشنی کا جھماکا مچلا—— روشنی دور تک آئینہ جڑتی گئی——

رات کی سیاہی شبنمی آنچلوں میں گھل گئی تھی۔

ایک دن جب وہ کالج پہنچا تو پورٹیکو میں نکہت انجینئرنگ کالج کے اس گیٹ پر نظریں گاڑے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں جادوگری پر مائل تھیں۔ اترائی ہوئی زلفیں گرتے گرتے رُخ سے مچل کر ٹھوڑی کے ایک کونے پر آ گئی تھیں——

آداب—— جیسے کوئی کلی چٹکی ہو، جیسے چاندنی کا کوئی نغمہ ٹوٹا ہو۔

کہیے—— مزاج تو اچھے ہیں آپ کے—— جلیسؔ نے کہا۔

جی—— آپ کی مہربانی سے—— وہ شوخی پر اتر آئی۔

اوہ—— بہت شوخ ہوتی جا رہی ہو۔

جی ہاں—— آپ کو کوئی اعتراض؟

کس کا پیریڈ ہے — ڈاکٹر حلیم خاں کا —

تب تو برے پھنسے — اچھا تم چلو — گفتگو انٹرول میں — سمجھی — میں ابھی آیا۔

آیئے — آیئے — آپ ہی کا انتظار تھا۔ آپ آئے بڑی مہربانی کی — اور پھر ایک زبردست قہقہہ — میز پر تالی بجی اور لڑکوں کے چہروں پر مسکراہٹ رینگ گئی —

میں خفیف سا ہو کر — نکہت کی طرف کنکھیوں سے دیکھا، کئی نگاہیں اُٹھیں اور واپس گئیں۔

نکہت — جی

آیئے — میں نے کینٹین چلنے کی درخواست کی۔ وہ جھجکی، شرمائی — پھر ایک معنی خیز اشارہ —

کالج میں ٹیچنگ پریکٹس شروع ہونے والی تھی۔ ڈیمانسٹریشن لیسن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہر طالب علم "لیسن پلان بک" پر Subjects اور Teaching Method لکھنے کے ذرائع ڈھونڈ رہا تھا — سبھی چہروں پر نروس نس اور گھبراہٹ کے آثار نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ ان ہنگاموں سے الگ سیمنار لائبریری میں منظور صاحب کے پاس بیٹھا آج کی جدید شاعری اور اس کے امکانات پر گفتگو کر رہا تھا — منظور صاحب کا خیال تھا کہ آج کی جدید شاعری میں ابہام اور ابلاغ پر اتنا زور دیا جانے لگا ہے کہ بعض وقت اشعار کے معنی و مفہوم تک پہنچنے کے لیے اچھی خاصی دماغی ورزش کی ضرورت پیش آنے لگتی ہے۔

وہ کچھ حد تک تو اُس سے متفق تھا لیکن یک سرے سے نئے استعارات و علائم کو ناکارہ، بے معنی کہہ کر ٹھکرا دینا مناسب نہیں تھا۔ اب وہی گل و بلبل، شمع و پروانہ، خنجر و قاتل جیسی تراکیب اور استعاروں کی گنجائش نہیں جس طرح انسانی زندگی میں نمایاں تغیر آ رہا ہے اسی طرح ادب میں بھی تبدیلی کی آنی لازمی اور لابدی ہے۔ اس سے انکار اور جدید شاعری کو یک سرے سے قابل ناعتنا ٹھہرانا میرے خیال سے کور ذہنی کے مترادف ہے۔

یہ تو سب درست ہے۔ مجھے بھی آپ کے اس خیال سے اتفاق ہے لیکن ایسا بھی کیا کہ شعریت کا گلا گھونٹ دیا جائے —

اس نے کچھ اور کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ نکہت نے چک سے جھانکا —

وہ معذرت کرتا ہوا اُٹھا اور نکہت کی طرف ہولیا۔ وہ کینٹین کی طرف جا رہی تھی —

کہیے — کیا حکم ہے میرے لیے — میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — اس

کے چہرے پر سنجیدگی کا پرتو تھا۔ ہاتھوں میں کتابیں کانپیں۔۔۔

پہلے تو آپ اپنے چہرے سے مرثیہ پن ختم کیجیے یہ بھی کوئی بات ہے اچھی بھلی چیز پر سنجیدگی کا لیبل لگا لیا جائے۔۔۔ مجھے ایسی صورتیں اچھی نہیں لگتیں۔۔۔ مسکرایئے۔۔۔ اُس نے اس کے بازو میں چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

سی۔۔۔ وہ چونکی۔۔۔ بہت برے ہیں آپ۔۔۔

توبہ۔۔۔ اتنی سی بات پر آنسو۔۔۔ چھی چھی۔۔۔ بولو ہنسو۔۔۔ دیکھو نہیں تو میں بھی رونا شروع کردوں گا۔۔۔ واقعی وہ اداکاری پر آمادہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی مسکراہٹ نہ روک سکی۔

دیکھو ایسی کوئی الجھن کی بات نہیں۔۔۔ میں سب لکھائے دیتا ہوں۔۔۔ لکھیے۔۔۔ وہ لکھتی رہی۔۔۔ اور وہ اس کی مخروطی انگلیوں کا رقص سفید کاغذ پر دیکھتا رہا۔ جیسے کوئی ستار پر کوئی پُر بہار نغمہ کی تخلیق کر رہا ہو۔ ہونٹوں کے زاویے گلاب کی کلیوں کو شرما رہے تھے۔ چہرے پر معصومیت کی چاندنی تھرک رہی تھی اور وہ اس خوابیدہ ماحول میں یکسو ہو رہا تھا۔۔۔

نکہت۔۔۔ جی۔۔۔ وہ چونکی جیسے کہیں ایک ساتھ جل ترنگ بج اٹھے ہوں۔۔۔

ہاں تم نے "ہم کیسے پڑھائیں" اور "تفہیمات" کا مطالعہ کر لیا۔۔۔

مطالعہ۔۔۔ نہیں۔۔۔

تو پھر کیوں لے گئی تھیں۔۔۔

جوابات تو انگریزی میں لکھنے ہیں۔ بلاوجہ اس میں سر کھپانا کہاں کی عقل مندی ہے۔۔۔ اُس نے کتابیں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔

میں نے خاموشی سے کتابیں واپس لے لیں۔۔۔

آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی۔۔۔ وہ جلیس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

نہیں۔۔۔ اس میں ناراضگی کی کیا بات۔۔۔ تم نے مانگی، میں نے دے دی۔ ویسے تمہارے خیال سے میں بھی متفق ہوں۔۔۔ اس یونیورسٹی میں جب "اردو" کو یہ مقام حاصل نہیں کہ اردو میں جوابات لکھے جا سکتے ہیں تو پھر اس بے چاری اردو کو اور کہاں جگہ مل سکتی ہے۔

آج ٹیچنگ پریکٹس کا پہلا دن تھا۔ نکہت کلاس لے رہی تھی اور وہ لائبریری میں بیٹھا اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ آئی، بہت خوش تھی۔

اس نے پوچھا— کہو کیسا لیسن (lesson) ہوا؟

اچھا تھا—اس نے کہا۔

لڑکوں نے تو پریشان نہیں کیا— یہاں کے لڑکے بے حد شریر اور شوخ ہیں۔ ذرا بھی موقعہ پا جائیں تو استاد (peoples teachers) کی خیر نہیں۔ کوئی نہ کوئی فقرہ موقعہ بہ موقعہ اچھالتے ہی رہیں گے اور ٹیچر بور ہوکر یا تو غصہ کا اظہار کرے گا یا نروس ہوکر سارے کے سارے اسٹیپس (steps) گڈمڈ کردے گا—

نہیں— نکہت بولی۔

میرا پیریڈ تو پانچواں ہے— میں نے چلتے چلتے کہا۔

تو آپ کب مل رہے ہیں— کل مجھے غالب کی غزل پڑھانی ہے۔ اشارے نوٹ کرادیں تو ممنون ہوں گی۔

اس میں ممنونیت کی کیا بات ہے— میں تو—

اس کی آنکھیں جھکیں اور جھکتی ہی چلی گئیں۔

چند لمحات کے لیے ساری فضاؤں میں کیف آگیں کیفیت طاری ہوگئی۔ لمبی لمبی پلکوں اور سرخ ہونٹوں سے نغمۂ جاں سوز کی ٹھنڈی کرنیں پھوٹ نکلیں—

آپ کیا سوچنے لگے— آپ نے میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا— اس نے سرگوشی کی۔

میں چونکا—

اردو ٹیچنگ کے نوٹس، غالب کے اشارے سب آپ کو لکھانے ہیں اور آج ہی لکھانے ہیں۔ میں کالج کی لائبریری میں دو بجے آپ کا انتظار کروں گی—

وہ تو میں لکھا ہی دوں گا— پہلے یہ بتاؤ تمہیں سہیل نے اردو نوٹس نہیں دیے کیا— میں نے شرارتاً سہیل کا نام لیا۔

اوہ— آپ ابھی تک ٹیز کرنے سے باز نہیں آئے۔

نہیں— میں ایسا تنگ دل نہیں ہوں نکہت— آخر اس نے کیوں نہیں دیا یہ جاننا چاہتا ہوں۔

ارے چھوڑیئے بھی اس قصے کو، آپ کہاں کی بات لے بیٹھے— میں نے تو صرف اُن سے نوٹس مانگے تھے وہ ہوں ہاں کرکے رہ گئے، زیادہ زور ڈالا تو کہنے لگے کہ وہ نوٹس آپ پڑھ نہیں سکیں گی— یہ

کہتے کہتے وہ روہانسی ہوگئی۔ میرے استفسار نے اس کے چہرے پر شام کی جاتی دھوپ پھیلا دی تھی۔

اوہ— واقعی تم سنجیدہ ہوگئی ہو— یوں برا نہیں مانتے پگلی— میں سب کچھ دے دوں گا اور— اب تو—

وہ کچھ کہتے کہتے رُکا اور گیٹ پر کھڑے لڑکے مسکرائے اور چند جملے ہوا میں پھینکے گئے۔

وہ نکہت کو لیے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

اب تم جاؤ— اس نے کہا۔ میں انہی لڑکوں کی وجہ سے تمہیں یہاں تک چھوڑنے آیا تھا—

شکریہ—

اس میں شکریہ کی کیا بات ہے، یہ تو میرا فرض تھا اور وہ بھی آپ کے لیے—

وہ نکہت سے مل کر اور شکستہ و مجروح ہوگیا تھا۔ الجھنیں شدید تر ہوگئی تھیں۔ اس کی ایسی حالت تھی جیسے کوئی کچی نیند سے جاگا ہو، آنکھوں میں جلن، سرخ ڈورے، دل کے ہر گوشے میں ایک بوجھل سناٹا، جذبات کی شدت میں اس کا سارا بدن کرب و بے چینی میں جل رہا تھا— وہ نڈھال ہوکر بستر پر لیٹ گیا۔

خواب دیکھنے والا انسان جس کی زندگی میں کوئی مضراب نہیں، ایک ایسا ساز جو بنتا ہے اور بگڑ جاتا ہے۔ سکون دائمی نہیں شاہراہِ حیات پر کوئی خوشی نہیں، کوئی نغمہ نہیں— آنکھیں صرف روتی ہیں وہ ہنسنا کیا جانیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔ نکہت میں تمہیں یاد کر رہا ہوں— ایک فیصلہ چاہتا ہوں— جیسے اس نے اس کے دل کی آواز سن لی ہو۔

وہ آگئی، سراپا بہار، شعر و نغمہ، نیلگوں آنکھوں میں جھلکتی ہوئی شراب۔ شگفتہ اور نرم ہونٹ، سنہلی گیسو، ستاروں اور پھولوں کے رنگ و بو کا پیکر—

آؤ نکہت—

تم اس اجاڑ مندر میں آہی گئیں، کون آتا ہے اس خرابے میں—

کیوں؟ کیوں نہ آتی— کیا اس وقت آپ مجھے یاد نہیں کر رہے تھے—

ہاں— تم اس طرح آئی ہو جیسے خزاں کے بعد بہار آجائے۔ تمہاری آنکھوں نے زندگی کے راستوں میں جادو جگا دیا ہے۔ تمہارا نیلگوں لباس اس اجلے اور خوبصورت آسمان کی یاد دلاتا ہے جس پر ستارے رقص کرتے ہیں اور چاند کی بیٹی افشاں چنتی ہے—

اچھا زیادہ ادبیات کا درس نہ دیجیے — میں آپ سے غالب کی ایک غزل پڑھنے آئی ہوں —

امتحان جو آ گیا ہے — پاس ہونے پر کیا تحفہ دو گی؟

تحفہ! —

میں تمہیں دل کی عمیق گہرائیوں سے چاہنے لگا ہوں۔ میں اپنی گمشدہ جنت پا کر کیوں نہ مغرور ہو جاؤں —

ہاں اتنا مغرور مت ہو جایئے کہ کوئی حادثہ ہو جائے —

حادثہ! —

حادثہ! تو میری زندگی کا جزو بن چکا ہے نکہت — مگر میں تمہارے ہوتے ہوئے ہر حادثے کا مقابلہ کروں گا — نکہت میں کبھی کبھی سوچتا ہوں یہ خوشیاں کہیں میرے سکون کو نہ ڈس جائیں اور پھر میں تمام عمر درد کی بخشی کرچیں ہی چنتا رہوں —

آپ بھی بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ سب سے زیادہ عقل مند وہی ہے جو دنیا اور دنیا کی چیزوں سے دل نہیں لگاتا —

ہاں نکہت سچ کہتی ہو — سچ مچ زندہ رہنا ایک بڑی ضرورت ہے۔ مگر یہ دنیا ایسی دنیا ہے جہاں سکون کا نام بھی نہیں۔ دنیا کا یہ سکون فریب نظر ہے۔ موسم سرما کی راتیں، موسم بہار کی موسیقی، گل ونسرین کی آہٹیں، چاند کی ٹھنڈی کرنیں اوروں کے لیے ہوں تو ہوں میرے لیے نہیں —

کیا تم اس سے اتفاق کرتی ہو —

نہیں! یہ سب کچھ آپ کے لیے ہی تو ہے۔ وہ تکلف چھوڑ کر گویا ہوئی۔ شگفتہ و شاداب چہرا، ستاروں کی روشنی، سرمئی پلکیں زندگی کے تمام رنگ و آہنگ آپ ہی کے لیے تو ہیں — مجھے دیکھیے وہ ہنستی ہوئی میز کے اور قریب آ گئی۔

نکہت کچھ سناؤ — اپنی زندگی کی کھوئی ہوئی جنت تمہارے گیتوں میں ڈھونڈوں گا — ایسا کوئی گیت گاؤ کہ زندگی مسکرا اُٹھے — وہ نکہت کے بالوں کو درست کرتے ہوئے بولا — میں تم کو پا کر تمام غم بھول چکا ہوں، کیا ہم زندگی بھر ایک ساتھ رہ سکتے ہیں؟

بہار کے سرخ آنچلوں میں پھول ہی پھول کھل اُٹھے —

واپس چلیے —

اس کی آنکھیں چمک کر ماند پڑ گئیں۔

وہ آہستہ روی سے گویا ہوئی — اجازت دیجیے — دیکھیے پونم کا چاند کتنا فاصلہ طے کر چکا ہے —

اچھا چلو میں تم کو ہوسٹل تک چھوڑ آؤں —

وہ واپس ہو رہا تھا تو زندگی اداس، شکستہ، شکست خوردہ آواز اس سے کہہ رہی تھی۔ بھاگ جاؤ — خوشبوئیں یکجا نہیں ہو سکتیں۔ نغمۂ حیات کا اسیر کرنا تمہارے بس کا روگ نہیں — چاندنی — کیف، خوشی تمہارے لیے نہیں — یہ لمحاتی خوشیاں دیرپا نہیں — یہ لڑکیاں سب فلرٹ ہیں — ان کی مسکراہٹ، ان کا خلوص سب مصنوعی ہے — یہ صرف اس وقت تک کسی مرد کے قریب رہتی ہیں جب تک کہ انہیں کسی مرد کی ضرورت ہوتی ہے — کسی مدد کی خواہش ہوتی ہے — اور پھر اُسے اس طرح بھول جاتی ہیں جیسے کوئی شرابی نشہ کی حالت میں کہی ہوئی باتیں بھول جاتا ہے —

وہ خوفزدہ آنکھوں سے زندگی کے نشیب و فراز میں جانے کیا تلاش کرتا رہا —

رات سیاہ ہو چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں کا تبسم بجھ گیا تھا۔ عمر بھر سسکتے رہنے سے بہتر ہے کہ میں اسے بھول جاؤں — اور ان فرسودہ روایات کی ڈور توڑ کر آزاد ہو جاؤں جس نے میری زندگی میں اگنت الاؤ جلا رکھے ہیں۔ ان عطا کردہ زخموں کو کھرچتے کھرچتے ناخن ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں —

وہ پھر ایک ایسا فیصلہ کر چکا تھا جو ایک غیور انسان کرتا ہے اور پھر اس فیصلہ کے ساتھ اس کے قدم کالج کے اس لان کی طرف اُٹھ رہے تھے جہاں اس نے چند ماہ پہلے نکہت کو گلاب کے پھول سے کھیلتے ہوئے دیکھا تھا — وہ اس پودے کے پاس کچھ دیر رُکا — تشنہ احساس نے ایک نئی کروٹ لی، آنکھوں سے کوئی نم چیز ٹپکی، شاید پگھلی چاندنی، شاید دردیلی چاندنی —

پھر — پھر — جیسے اس پر جنون کا دورا پڑا ہو — گلاب کا پودا سہا سہا کھڑا تھا — پودے کی تمام کلیاں اور پھول شاخوں سے بے نیاز زمین پر بکھری پڑی تھیں۔ گلاب کی خوشبو، اس کی نکہت ہوا میں زہر گھول گئی تھی — دور آسمان پر چاند منھ چھپائے شرمندہ شرمندہ واپس ہو رہا تھا — اور وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ ہوسٹل واپس لوٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیوں میں چند پنکھڑیاں تھیں جس میں خوشبو نہ تھی، نکہت نہ تھی — صرف اداس اور مسلی آرزوؤں کی کرچیں تھیں —

——————۱۹۶۵ء

نہیں بھول سکتا

میں اپنے اس نئے چہرے کے ساتھ اور اجنبی ہو گیا ہوں۔ پچھلے دنوں میں اس نئے چہرے سے متعارف ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے مبارک بادیں دی ہیں۔ دعائیں دی ہیں اور اس نئی تبدیلی کو نئے دور سے تعبیر کیا ہے۔

لیکن میں انہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں اس نئے چہرے کے ساتھ اور بھی اُداس ہو گیا ہوں اور پھر میں اپنے اس دیرینہ رفیق کو کیسے بھلا سکتا ہوں جس نے ہر لمحہ میری دل جوئی کی ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر اپنی رفاقت سے خوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔

مجھے وہ مسکراتا، شگفتہ، متین و شفیق چہرہ ہمیشہ یاد رہے گا جس کے قرب نے احساس کی دولت بخشی تھی۔ وہ مترنم لب و لہجہ، وہ مسکراتی اور کھلکھلاتی آنکھیں۔ وہ شگفتہ اور ترو تازہ لب و رخسار اور وہ یادیں جہاں میں نے پھولوں کی آغوش میں، ستاروں کی جھرمٹ میں، کہکشاں کی نرم روشوں پر انگنت خواب دیکھے تھے۔ وہ لمحات میرے اس رفیق کی یاد دلاتے رہیں گے جس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں، سنیما ہالوں میں، کالج کی لائبریری میں، پارکوں میں کسی خاموش گوشوں میں وقت گزارے ہیں۔ جس کی باتیں، جس کے مسکراتے اور گنگناتے ہونٹوں سے اپنی افسردہ زندگی میں امید کی آہٹیں، امید کی نرم کرنیں اور امید کی

شمعیں جھلملاتی دیکھی ہیں۔

لیکن وہ چہرہ جانے کہاں کن اندھیروں میں چھپا دیا گیا ہے اور مجھے اس نئے چہرے سے جوڑ دیا گیا ہے جس نے میری افسردگی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

میری افسردگی بڑھتی جائے گی اور ایک دن یہ افسردگی طوفان بن جائے گی اور میں اسی طوفان میں تنکے کی طرح بہہ جاؤں گا۔

کاش وقت نے میرے دل کی عمیق گہرائیوں میں جھانکا ہوتا۔ میری اداس آنکھوں کی سیاہ پتلیوں میں وہ تصویریں دیکھی ہوتیں جنہیں میں نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا، جنہیں قوس وقزح کے رنگوں سے سجایا تھا۔ جن میں میرے خون کی، میرے احساس کی دھڑکنیں جاں گزیں ہوگئی تھیں۔ اُف وہ تصویریں کسی جابر ہاتھوں نے پاش پاش کر دی ہیں۔ میں ان بکھرے ٹکڑوں میں ماضی کی دل خراش چیخیں سن رہا ہوں۔ یہ چیخیں جو میرے وجود کو جلا کر خاک کر دیں گی اور میں بگولہ بن کر فضا میں تحلیل ہو جاؤں گا۔

اس وقت یہ زمانہ اپنی بے دردی، اپنے ظلم اور اپنی ستم گاری کا احتساب کرے گا اور ہاتھ مل کر ندامت کے آنسوؤں سے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرے گا مگر اس کا یہ گناہ معاف نہیں کیا جا سکے گا کیونکہ اس نے ایک فنکار کو قتل کیا ہے۔ اس کے خون کی سرخیاں شفق زاروں میں، سورج کی زرد کرنوں میں، گلاب کی پنکھڑیوں میں، تتلیوں کے خوبصورت پروں میں ریزہ ریزہ چمکتی ہیں۔ بوند بوند ٹپکتی ہیں۔

مجھے وہ لمحات اکثر یاد آتے ہیں جب میں سڑکوں پر خالی جیب اور خالی پیٹ کے ساتھ احساس کی دُکان سجائے بیٹھا تھا۔ کوئی گاہک کوئی خریدار ایسا نہ ملا جو میرے اس احساس کی قیمت لگا سکتا۔ صرف وہی پرانا چہرہ تھا جس نے میری ہمتیں بڑھائی تھیں۔ میرے خالی جیبوں میں چند سکے ڈالے تھے۔ میرے خالی پیٹ میں چند سوکھی روٹیاں پہنچائی تھیں۔

میں اپنی مایوسی، نامرادی اور بے کسی کے عالم میں اس راستے پر ہولیا تھا جو دھوکے کا راستہ تھا، فراڈ کا راستہ تھا لیکن خود کو بہلانے کے لیے احساس کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ میں سیاہ اور سرخ رنگوں میں انگلیاں ڈبولوں اور گلاس میں بھرے پانی کو امرت جان لوں۔ میں نے وقت سے انتقام لینا چاہا، خود کو تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچا کر خوش ہوتا رہا۔ یہ میرا خواب تھا جو بکھر رہا تھا۔ شکست کھا رہا تھا۔ پے در پے جذبات نے میری زندگی میں زہر بھر دیا تھا۔ میں اس زہر کو سگریٹ کے مرغولوں میں، سبز پتوں کے سرخ پانی میں گھولنے کی سعی کر رہا تھا اور وہ میرا رفیق قدم قدم پر مجھے سنبھالتا،

مجھے دلاسے دیتا، مجھے مایوسیوں، نامرادیوں اور بے زاویوں کے عمیق جنگل سے نکالتا رہتا۔ اور میں ڈگمگاتا، بھٹکتا، سوتا، جاگتا اس کی رفاقت میں زندگی سے نبرد آزمائی کرتا رہا۔

اور وہ لوگ جو میرے وجود کے ذمہ دار تھے آنکھیں موند لی تھیں۔ مجھے تباہ و برباد ہوجانے کے لیے ان خطرناک لوگوں کے درمیان چھوڑ دیا تھا لیکن وہ خطرناک لوگ جن کے چہروں پر مسکراہٹ، محبت اور خلوص کی پرچھائیاں تھیں انہوں نے میرے غم کو سیاہ اور سرخ چتوں سے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ صحیح تھا کہ وہ لوگ جن کے چہروں پر خلوص کی گرمی دیکھی تھی، ہونٹوں پر شفیق مسکراہٹ رقص کرتے دیکھی تھی۔ دراصل وہ سب دھوکا تھا فراڈ تھا۔ اور میں اسی فراڈ میں یکسو ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

امید نے وقت کی کلائی مروڑ ڈالی تھی اور میں مطمئن تھا۔ میں نے زمانہ سے انتقام لے لیا تھا لیکن ابھی انتقام پورا نہیں ہوا تھا کہ زمانے نے مجھے نئے چہرے سے متعارف کرادیا اور میرے اس دیرینہ رفیق کو سرِ بازار سولی پر چڑھادیا۔ میرا رفیق ہی مغلوب نہیں ہوا میرا احساس بھی مغلوب ہوگیا اور میں یہ خود بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے اس دیرینہ رفیق کا قاتل ہوں۔

ایسے بہت کم لوگ ہیں جو میرے درد کو سمجھ سکتے۔ جب وہ خود کو نہیں پہچانتے، نہیں جانتے تو مجھے کیا جانیں گے، کیا پہچانیں گے۔ میں شور و شرابے سے دور تنہائی چاہتا ہوں، مجھے اندھیرا پسند ہے، مجھے کھردرا بستر پسند ہے، مجھے یہ کم خواب پردے، یہ ریشمی بستر، یہ خوشبوئیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔

اُف وہ لمحات جو میری زندگی میں دھوپ چھاؤں کی طرح سمندر کے مدوجزر کی طرح تھے، کبھی مایوسیاں، کبھی امیدیں، کبھی اندھیرا، کبھی روشنی، کبھی نفرت، کبھی محبت، کبھی صحرا، کبھی گلشن، میری زندگی انہی محوروں پر گردش کرتی رہی۔ میں ہچکولے کھاتا، ڈوبتا، ابھرتا اپنی کشتیٔ حیات کھیتا رہا اور جب مجھے ساحل ملا تو جانے کتنے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ جانے کتنے لوگ دوڑتے، بھاگتے چلے آرہے تھے۔ اور میں ساحل پر کھڑا ان کی موقعہ پرستی پر خاموش لعنتی قہقہہ لگا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا یہ لوگ اس وقت کہاں تھے جب میں تند و تیز لہروں سے لڑ رہا تھا۔ وحشت ناک طوفانوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ صرف وہی دیرینہ رفیق تھا جس نے مجھے اپنی سچی رفاقت دی تھی اور زندگی کے نشیب و فراز سے آشنا رکھا تھا۔ میں اس دیرینہ رفیق کو کیسے بھول سکتا ہوں جو میرا رازداں، میرا ہمدرد، میرا دوست اور میرا غم گسار تھا۔

میں اس نئے چہرہ کو اس سے کب تک چھپاپاؤں گا۔ کیا وہ پرانا چہرہ طعنہ نہیں دے گا۔ انگلیاں نہیں اٹھائے گا۔ نہیں نہیں — میں پرانے چہرے سے بے وفائی نہیں کرسکتا۔ اس کے احسانوں کو نہیں

بھلا سکتا۔ اسے بھول جانے کی بھی سعی نہیں کر سکتا۔

ہاں میں نے اس نئے چہرے پر یہ ضرور واضح کر دیا ہے کہ تم میرے جسم کا حصہ ضرور بنا دیے گئے ہو لیکن میں تمہیں وہ خوشی نہیں دے سکوں گا، وہ محبت نہیں دے سکوں گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم اسی اجنبیت کی دیوار کو یوں ہی کھڑی رہنے دینا اور کسی لمحہ بھی یہ کوشش نہ کرنا کہ میں اس دیرینہ رفیق کو بھلا کر تمہارا ہو جاؤں گا۔ میں اس دیوار کو مسمار نہیں کر سکوں گا لیکن دن بہ دن اس دیوار کو ضرور بلند کرتا جاؤں گا۔ میں اس پرانے چہرے کو نہیں بھول سکتا — نہیں بھول سکتا — نہیں بھول سکتا۔

——— ۱۹۶۲ء

فتّو آپا

عشرت لاج میں فتو آپا کیا آئیں سارا عشرت لاج قہقہہ بار ہوگیا۔ ہار سنگار کے خوابیدہ خاموش رومان پرور سائے میں حیات زا قہقہوں کی باڑھ آگئی۔ ہم لوگوں کی روایتی سنجیدگی و متانت لونا لگی دیواروں کی طرح پوپلی ہوگئیں اور سڑے ہوئے دانتوں کی طرح گرنے لگیں۔ ابّو جان سے لے کر نوکر تک سب ہی ان کے اخلاق، ان کی شیریں بیانی کے نغمہ کی تیز ہوا میں بہہ گئے۔ وہ صبح کاذب اٹھتیں اور مجھے جگاتیں۔ پھر ہم دونوں پائیں باغ میں ٹہلا کرتے۔ فتو آپا زیادہ تر صبح کے وقت گوری چنبیلی کے مانند سفید براق لباس میں ملبوس رہتیں۔ وہ مجھے اپنے ڈگری کالج کے گذشتہ واقعات پُر لطف پیرایہ میں سناتیں۔ یا میرے کہنے پر مجاز کی کوئی غنائیت سے بھرپور نظم گنگناتیں۔ ان کے گلے میں راگوں کا بسیرا تھا۔ ان کے حسین چہرے پر گنگناتے وقت وہی سماں بندھتا جو صبح صادق کے وقت جاتی رات اور آتے دن کا ہوتا ہے۔ اور فتو آپا تھیں بھی بڑی خوبصورت۔ وہ مصور کے نازِ کمال کی طرح بے جان نہیں تھیں۔ وہ ایلورہ کے مجسمہ کی طرح سنگ دل نہیں تھی۔ وہ ایک منہ بند کلی تھیں۔ ایک ایسی کلی جو کھلنے کا ارادہ کر رہی ہو۔ ایک شعر تھیں جو موزوں ہوجانے کی فکر میں ہو۔ ایک خیال تھا جو اپنا پیکر تیار کر رہا ہو۔

فتو آپا سائبان کے ایک ستون کے سہارے کھڑی آنکھوں کو بہت اچھی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہاں

پر روئیدہ تیز سرخ شعلہ رنگ پھول آگ کی طرح لہلہا رہے تھے اور انگور عشق پیچاں کی بیلوں میں چھپے ہوئے شہ نشین سے بلند ہوتی ہوئی طلعت کی سحر آگیں آواز دل کو بے چین کر رہی تھی۔ تب ہی ابو کی کار لان میں آکر رکی۔ ان کے ہم راہ بے حد پولشڈ نوجوان بھی اترا۔ ابو نے مجھے مخاطب کیا۔ انجم یہ تمہارے ڈپٹی چچا کے صاحبزادے ہیں تمہارے جلیس بھائی کرکٹ کے نہایت اچھے کھلاڑی اور ماہنامہ ''جل ترنگ'' کے ایڈیٹر۔

وہ میرے ساتھ امی کے پاس آئے۔ انہوں نے نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا۔ امی بہت تپاک سے ملیں۔

''کہو اچھے ہو۔''

''بس آپ دیکھ رہی ہیں جسم کا سارا حصہ اپنی جگہ پر ہے۔''

فضا میں ایک مسکراہٹ ناچی۔ امی بھی مسکرانے لگیں۔ تب ہی فتو آپا آگئیں۔ جلیس بھائی نے دیکھا، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے جلیس بھائی بوکھلا گئے ہیں اور فتو آپا بھی انہیں دیکھ کر ٹھٹھک کر کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ ان کے جاوا جسم جیسے ہونٹ ایک دم سرخ ہو اٹھے۔ جیسے پیر میں کانٹا چبھ گیا ہو، دوپٹہ کا سرا کسی شاخ سے الجھ گیا ہو۔ جلیس بھائی نے سنبھلتے ہوئے آپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی تعریف؟''

امی نے جواب دیا— ''میری بھانجی ہے۔ بی اے کا امتحان دے کر ذرا گھومنے پھرنے میرے پاس چلی آئی ہے۔'' جلیس بھائی نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا— ''چہرے سے تو یہ ہائی اسکول بھی نہیں معلوم ہوتیں۔'' فتو آپا جیسے کچھ تلملا سی گئیں۔ امی ہنسنے لگیں۔ پھر وہ چلے گئے۔ جلیس بھائی روز آتے۔ وہ نہایت کھلنڈرے، جامہ زیب، فرخندہ رو انسان تھے۔ وہ نہایت بے تکلفی سے چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ فیلڈنگ کرتے اور قہقہہ لگاتے۔

ہمارے فرشتوں کو بھی یہ گمان نہ تھا کہ جلیس بھائی اتنے بے تکلف، اتنے کھلنڈرے، اتنے پرخلوص ہوں گے۔ ہم لوگ ان کے بارے میں قیاس آرائیاں کیا کرتے تھے کہ جلیس بھائی جو کرکٹ کے اتنے اچھے کھلاڑی اور ماہنامہ ''جل ترنگ'' کے ایڈیٹر ہیں، وہ نہایت سنجیدہ، کم گو، مرنجانِ مرنج قسم کے انسان ہوں گے۔ وہ اس کے برعکس نکلے۔ جب بھی آتے تو میرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لاتے۔ اپنے پرچوں کی پرانی فائلیں، کوئی خوبصورت سی کتاب۔ ٹی آر کے بسکٹوں کے ڈبے یا کوئی معرکتہ آرا لطیفہ۔ ایک دن جلیس بھائی دو بہت ہی خوبصورت رسٹ واچ لائے۔ ایک تو مجھے دے دی اور دوسری

میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ''یہ اپنی فتو آپا کو دے دینا۔'' وہ رسٹ واچ دے کر چلے گئے اور میں دوڑی دوڑی فتو آپا کے کمرے میں آئی۔ وہ اردو کے نامور افسانہ نگار کرشن چندر کی ''ایک عورت ہزار دیوانے'' دیکھ رہی تھیں جسے ادارہ بیسویں صدی نے نہایت خوبصورتی سے شائع کیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''بہت ہی خوبصورت ہے تمہاری رسٹ واچ۔ کیا خالو جان لائے ہیں؟''

''جی نہیں—'' میں نے جواب دیا۔

انہوں نے پھر پوچھا کون لایا ہے؟

میں نے کہا— ''جلیس بھائی۔''

ہنس کے کہنے لگیں— ''بہت چاہتے ہیں تم کو؟''

میں نے بھی ہنس کر جواب دیا— ''لیکن آپ سے کم۔''

وہ کچھ بگڑ سی گئیں۔ ''تم بدتمیز ہوتی جا رہی ہو۔''

''شکریہ!'' یہ کہہ کر میں نے دوسری رسٹ واچ ان کے سامنے رکھ دی۔

''یہ لیجیے۔ جلیس بھائی نے آپ کو بھی دیا ہے۔''

ان کا چہرہ کچھ زرد سا ہو گیا۔ تھوڑی دیر رسٹ واچ دیکھتی رہیں۔ جب میں چلنے لگی تو فتو آپا نے مجھ سے کہا۔ ''یہ رسٹ واچ انہیں واپس کر دینا اور کہہ دینا آپ کا شکریہ۔ مجھے ان چیزوں کا کوئی شوق نہیں۔''

میں نے رسٹ واچ واپس لے لی۔ نہ جانے کیوں مجھے فتو آپا کے اس طرزِ عمل سے دھچکا لگا۔ فتو آپا جھوٹ بول رہی تھیں۔ اگر انہیں شوق نہیں تو یہ ہر وقت گھڑی کیوں باندھے رہتی ہیں۔ شام کو جلیس بھائی آئے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا— ''تم نے گھڑی دے دی؟''

میرا دل چاہا کہہ دوں جی ہاں— لیکن میں جھوٹ نہ بول سکی۔ میں نے کہا— ''فتو آپا نے شکریہ ادا کیا ہے اور کہا ہے کہ مجھے ان چیزوں کا شوق نہیں ہے۔''

وہ اداس ہو گئے۔ ''بہت بداخلاق ہیں تمہاری آپا۔'' ان کے لہجہ میں آنسوؤں کا ہلکا سا اشارہ تھا۔ پھر جلیس بھائی کئی دن تک نہیں آئے۔ امی نے کلثوم کو بھیجا تو معلوم ہوا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ملنے گئی۔ وہ اپنے کمرے میں دریچے کے پاس آرام کرسی کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے اور چاند کی کرنیں ان کے چہرے پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ بہت غور سے چاند کو دیکھ رہے تھے۔ افق پر چاند کسی راہب کے عبادت خانہ کے مانند تھا۔ تارے کلیسا میں دعا گو رومانی جوڑوں کی آرزوؤں کی طرح تابندہ تھے۔ میں

دیر تک ان کے سرہانے کھڑی رہی لیکن انہوں نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا — میں نے مجبور ہو کر آواز دی۔

"جلیس بھائی —"

وہ چونک پڑے۔ "ارے تم کب آئیں؟ انجم — آؤ — بیٹھو۔"

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا — "میں بہت دیر سے کھڑی تھی — لیکن آپ نے دیکھنے کی زحمت بھی نہیں فرمائی۔"

"تمہاری فتو آپا کو دیکھ رہا تھا — وہ دیکھو چاند میں بیٹھیں چرخہ کات رہی ہیں۔"

میں ہنس دی — "نوج میری فتو آپا اتنی بڑھیا ہوں۔"

جلیس بھائی نے ایک سرد آہ کے ساتھ صرف "ہوں" کہا اور تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد پھر بولے — "نہ جانے تمہاری فتو آپا کس زمین کی پیداوار ہیں۔ اتنی خشک لڑکی تو میں نے آج تک نہیں دیکھی —" جب میں واپس آنے لگی تو انہوں نے کہا — "فتو سے کہہ دینا اس نفرت سے کیا فائدہ۔"

میں نے فتو آپا تک ان کا پیغام پہنچا دیا۔ وہ خاموش رہیں انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا — یہ تک نہ پوچھا کہ جلیس بھائی کیسے ہیں۔ میں روز صبح کاذب فتو آپا کے ساتھ ٹہلنے جایا کرتی لیکن میں نے یہ غور کیا کہ وہ زیادہ تر کچھ سوچا کرتی ہیں۔ ایک پژمردگی، ایک سناٹا — ایک جمود — ان کی زندگی پر چھا رہا تھا۔ وہ سرشام ہی سے سونے کے لیے بستر پر چلی جاتیں — جب تک جلیس بھائی کوٹھی میں رہتے وہ اپنے کمرے میں رہتیں۔ نہ جانے انہیں اتنی نفرت، اتنی چڑھ کیوں تھی جلیس بھائی سے۔

سارا گھر جلیس بھائی کو چاہتا تھا۔ وہ اگر ایک وقت نہ آئے تو امی کلثوم کو بھیجتیں۔ ابو جان بار بار پوچھتے لیکن فتو آپا تھیں کہ کبھی جھوٹے منہ بھی جلیس بھائی کو نہ پوچھا۔ فتو آپا ان کے ذکر سے ہی پریشان ہو جاتیں۔

ایک دن امی نے جلیس بھائی سے پوچھا۔ "کیا تمہاری فتو سے بات چیت نہیں؟"

جلیس بھائی ہنسنے لگے — "جی! کبھی کبھی بات ہو جاتی ہے۔ ویسے بات چیت کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی۔" امی خاموش ہو گئیں — لیکن میں نے جلیس بھائی کے جواب میں ایک چبھن، ایک کسک، ایک بے چینی محسوس کی۔ میں نے سوچا آج ضرور فتو آپا سے میں لڑوں گی۔ جلیس بھائی کے جانے کے بعد فتو آپا کے کمرے میں گئی، وہ آہستہ آہستہ پرسوز دھن میں مجاز کی کوئی نظم گنگنا رہی تھیں۔ میں نے آواز دی فتو آپا —

انہوں نے تکیہ سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے دیکھا ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو تھے۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں — میں نے پوچھا — "ارے یہ آپ رو کیوں رہی ہیں؟" جلدی

سے انہوں نے آنسو پونچھے اور ہنسنے لگیں — وہی پھولوں کی ہنسی، وہی من موہنی ہنسی، ایسی ہنسی جو آنسوؤں کے چلمن سے جھانکتی ہے۔ میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"آپ کیوں رو رہی ہیں فتو آپا؟"

انہوں نے میرے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "دھواں لگتا ہے کسی کے دل کے جلنے کا۔"

جلیس بھائی کے دل کے جلنے کا—

"بری بات، ایسی بات نہیں کرتے۔ کوئی سن لے تو کیا ہو؟"

"آخر آپ جلیس بھائی سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہیں؟"

"وہ مجھے رلاتے بہت ہیں۔ انہوں نے میری ہنسی چھین لی، سکون لوٹ لیا، تمہارے جلیس بھائی چور ہیں۔"

میں کچھ کہنے والی تھی کہ امی نے آواز دی— "فتو ذرا یہاں آنا۔"

شام کو جب جلیس بھائی آئے تو انہوں نے سینٹ کی بھینی خوشبو سے بسا ہوا ایک سرخ لفافہ دیتے ہوئے کہا۔ "اپنی فتو آپا کو چپکے سے دے دینا۔"

میں نے جب فتو آپا کو وہ خط دیا تو وہ چونک پڑیں۔ انہوں نے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگیں۔ میں اُن کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ان کا چہرہ اُتر رہا تھا۔ انہوں نے خط ختم کیا پھر خط معہ لفافہ چاک کر کے اس کے پرزوں کو دریچہ کے باہر ہوا میں اچھال دیا۔ پھر مجھ سے کہنے لگیں—

"دیکھو! انجم اب اگر تم کوئی خط لائیں تو میں امی سے شکایت کردوں گی۔"

میں سہم گئی— دوسرے دن خالہ کا تار آیا۔

فتو آپا نے جلدی جلدی سب ٹھیک کیا اور روانہ ہوگئیں۔ ابو جان کے ساتھ میں بھی فتو آپا کو سی آف کرنے گئی۔ فتو آپا جب ٹرین میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گئیں تو انہوں نے مجھ سے پوچھا— "تمہارے جلیس بھائی یہاں نہیں آئے؟" مجھے بہت تعجب ہوا کہ آج یہ جلیس بھائی کو کیوں پوچھ رہی ہیں۔

میں نے جواب دیا ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

"کیا ہوا ان کو— کل شام کو تو اچھے تھے؟"

"رات سے بخار آرہا ہے۔"

فتو آپا چپ ہوگئیں۔ اداس اداس کھوئی کھوئی کچھ سوچنے لگیں۔ پھر ان کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

میں نے بے تاب ہو کر پوچھا— ''فتو آپا یہ کیا؟''

''کچھ نہیں— '' ان کی بڑی بڑی آنکھیں ایک بار اٹھیں اور جھک گئیں اور پلکوں سے کوئی چیز ٹپک پڑی۔ شاید پانی کی ایک بوند، شاید پگھلی ہوئی چاندنی، شاید بھٹکی ہوئی چاندنی۔

انہوں نے اپنی انگلی سے انگشتری اتاری اور میری طرف بڑھا کر کہنے لگیں— ''یہ اُن کو دے دینا اور میرا اسلام کہہ دینا۔''

اتنے میں ابو جان کسی صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے کمپارٹمنٹ کے پاس آ گئے۔ گارڈ نے جھنڈی دکھلائی۔ میں ان کے پاس سے ہٹ کر پلیٹ فارم پر آ گئی اور ٹرین روانہ ہو گئی۔

فتو آپا چلی گئیں، کوٹھی میں سناٹا چھا گیا۔ باغ کی بلبلیں اڑ گئیں۔ مجاز کی غنائیت سے معمور نظمیں دور چلی گئیں۔

میں نے جلیس بھائی سے فتو آپا کا سلام اور پیغام کہہ دیا اور وہ انگشتری دے دی۔

وہ رونے لگے۔ انہوں نے انگشتری کو غور سے دیکھا۔ پھر اسے چوم لیا۔

تھوڑے دنوں بعد اپنے جریدہ ''جل ترنگ'' کے سلسلے میں دہلی چلے گئے۔ اب چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا تھا جیسے دن و رات کو صبح کی لو مار گئی ہو۔ جلی جلی شامیں، اجاڑ اجاڑ سی صبحیں اور ایک دن ابو جان کے پاس خالہ کا تار آیا ''فتو کی حالت نازک ہے'' اس تار نے سب کے ہوش و حواس گم کر دیے۔ دوسری ہی ٹرین سے سب لوگ فتو آپا کے پاس پہنچ گئے۔ ہائے میں نے دیکھا کہ گھونگھریالے بال تکیے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ سفید چہرہ، بند آنکھیں، میں رو کر لپٹ گئی— ''فتو آپا— فتو آپا— یہ کیا ہو گیا آپ کو؟''— انہوں نے بہت آہستہ سے آنکھ کھولی، میں رو کر لپٹ پڑی۔ مجھے انہوں نے یوں دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں نے کہا— ''فتو آپا! میں ہوں انجم— للہ کچھ بات کیجیے۔''

لیکن وہ کچھ بول نہ سکیں۔ ان کے لب ہلے ضرور— لیکن سمجھ میں کچھ نہ آیا— یہ کیا کہہ رہی ہیں— اور دوسرے دن فتو آپا چل بسیں۔ ان کے چہرے کے کراس پر جلیس بھائی کی محبت کی لاش لٹک رہی تھی۔ وہ اس سولی چڑھی محبت کو سبھوں کی نظر سے چھپا کر بھرے پُرے گھر سے چلی گئیں، ٹائفائڈ اور ڈبل نمونیہ تو ایک بہانہ تھا۔ سینہ کے اندر لگی ہوئی آگ— بھڑکتی ہوئی آگ— دبی ہوئی آگ بجھ گئی۔ آسمان پر چاند خم ہو گیا تھا۔ رات سورج کو قتل کر آئی تھی۔ چاند تاروں میں روشنی کب تھی۔ ان میں سورج کی آب و تاب کب تھی۔ دھوئیں کی چادر سے قطرہ قطرہ روشنی کا بکھر رہا تھا، سمٹ رہا تھا، بجھ رہا تھا۔

———— ۱۹۶۷ء

صرف پندرہ منٹ

کھٹ کھٹ

آواز

آوازیں

اس نے برش کو تپائی پر زور سے پٹخ دیا اور خود پیر پٹختا ہوا نیچے اُترا۔ وہ سیڑھی تک گننا بھول گیا جبکہ اس کی عادت میں یہ داخل تھا کہ جب وہ نیچے اُترتا یا نیچے سے اوپر چڑھتا گنتی کرنا نہ بھولتا۔ مگر آج جیسے وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ وہ من ہی من بدبدایا۔ عجیب بے موقعہ لوگ ہیں۔ وقت کا تعین ہی نہیں کر سکتے۔

کون ہیں آپ؟ کیا کام ہے آپ کو—؟ وہ بغیر کنڈی کھولے بدبدایا۔

کنڈی کھول کر باہر جھانکا اور دیکھا خط دیکھ کر اس کی ساری جھنجھلاہٹ غائب ہوگئی—

اور پھر وہ سیڑھی گنتے ہوئے نیچے سے اوپر چڑھ رہا تھا۔

جلدی جلدی خط کے جوڑوں کو کھولا—

ذہن تلملایا

بہر حال ایک خوش گوار جھونکا دل و دماغ میں بغیر سیڑھی لگائے اُتر گیا۔

وہ مسکرایا۔ متعدد بار مسکرایا

اور —

برش پر لگا صابن خشک ہو کر ادھر ادھر اڑ رہا تھا —

خط پڑھ کر اُسے پرانی باتیں یاد آ گئیں۔ ۹ بج چکے تھے۔ آفس پہنچنا بھی تو ضروری تھا۔ ایک آہنی مشین کی طرح اس کے جسم نے حرکت کی اور برش کو پانی میں غوطہ دے کر چہرے پر رگڑنا شروع کیا۔ سارا چہرہ سفید، سفیدہ بادلوں سے گھر گیا۔ اور پھر اس کا ذہن آسمان پر گھرے بادلوں کی طرف چلا —

پانی — پانی

کوئی اپنی مرضی کا دخل تو نہیں جب چاہو پانی برسالو۔ جب ماں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے۔ آنکھ کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔

قحط افلاس، غربت، بے چارگی اور سرمایہ دار جونک کی طرح غریب شکستہ جسموں سے لپٹ کر خون چوس چوس کر موٹے ہوتے جاتے ہیں۔ رام داس کو اگر کوئی سیٹھ رام داس کہہ کر مخاطب کرے تو بے حد خوش ہوتا ہے۔ بابو جی کیا بجا ہے سوا نو بجے ہیں۔ نو بج کر پندرہ منٹ — آج دفتر نہ جایئے گا کیا؟

اس کو ہوش آیا تو اس کی داڑھی کے بال خشک صابن کے پیچھے اس طرح جھانک رہے تھے جیسے کسی مزدور کی پھٹی قمیص کے نیچے سینے پر کھردرے بال۔ اس نے ہاتھ کو تیزی سے حرکت دی۔ سارا چہرہ بادلوں سے ڈوب گیا۔ کمبخت —

کمبخت بلیڈ بھی تو نہیں۔

مصیبت ہے! داڑھی کیا ہوئی کسی کچی دیوار پر اُگی گھاس ہو گئی۔ بلیڈ کہاں سے تلاش کروں۔ مادھو! کھانا لگاؤ — اور کوئی پرانا سا بلیڈ پتھر پر رگڑ کے لے آؤ۔ جب تک میں کھانا کھالوں۔ یہ کوئی کھانا ہے۔ وہی دال، وہی ہری سبزی، یہی سب کھاتے کھاتے میں خود ہرا ہو گیا ہوں۔ مزاج تو اس قدر ہرا ہوا ہے کہ پوچھنا نہیں۔

اُسے اپنی ماں یاد آ گئی۔ وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو پنکھا جھلنے بیٹھ جاتی — کس قدر محبت تھی اس کی ماں کو — اُس کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ ماضی بھی عجیب داستان ہے جس میں سوائے آنسو کے اور ہے ہی کیا۔ مگر حال تو اس سے بدتر۔ مستقبل اس ملک میں جہاں ساری شرافت، انسانیت اس طرح ہوا ہو گئی ہے

جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔۔۔

اب وہ پھر برش کو اپنے چہرے پر پھیر رہا تھا۔ بادلوں کا جم غفیر اکٹھا ہو گیا اور اس میں سے جھانکتے ہوئے کالے کالے بال۔ کیا بے ہودگی ہے۔۔۔ آج بناؤ۔۔۔ کل پھر موجود۔ یہ بال جہاں دیکھو سر اُٹھائے موجود۔۔۔ عجیب سر چڑھے ہیں۔ کمبخت۔۔۔ اُس نے بلیڈ کو گھمایا۔۔۔ کھر رکھر اُف کچھ بھی تو نہیں۔۔۔ ذرا بھی بال بیکا نہ ہوا ان کمبختوں کا۔۔۔ اُف کاٹ بھی ڈالا۔۔۔ خون کی بوند۔۔۔ چمک اُٹھی مگر بال اپنی جگہ موجود۔ بادل پھر غائب۔۔۔ وہی سر اٹھائے بال۔۔۔ پونے دس ہو گئے۔۔۔

قمیص پتلون پہنی اور چہرے پر پھر ہاتھ پھیرا۔۔۔

اوپر سے نیچے اُترا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔

اب وہ سائیکل پر بیٹھا پیر چلا رہا تھا اور ذہن تارکول کی لمبی چوڑی سڑک پر اُڑ رہا تھا۔ آدمیوں کا سیلاب۔۔۔ مرد، عورت، جوان، بوڑھے سب گڈ مڈ تنکوں کی طرح سر اٹھائے، پیر پھیلائے بہہ رہے تھے۔ وہ بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا اور بہنے لگا۔ ہر جگہ بہنا۔۔۔ مدام بہنا، جب تک پانی گلی، کوچہ، ندی، نالا، نہیں بہتا کوئی جینے کا شعور نہیں آتا۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے چہرے کی طرف چلا گیا۔ وہی کھر دار کٹا پھٹا چہرہ۔ وہ گرتے گرتے بچا۔۔۔

نان سنس۔۔۔ ایک خوبصورت لڑکی کا فقرہ ہوا میں اُچھلا اور اس کی کھوپڑی پر لگا، کسی کنکر پتھر کی طرح نہیں بلکہ پانی کے بھرے غبارے کی طرح جو چوک میں دس دس پیسے میں شیتل غبارہ والا بیچتا ہے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی اور وہ خود بھی ایک سیلون میں رینگ گیا۔۔۔ اور ہاتھ چہرے پر پھسل پڑا۔۔۔

اور بادلوں کا ایک ڈھیر اس کے چہرے پر بکھر گیا اور اس میں سے جھانکتے کالے، سیاہ نوک دار بال ریزر کے تیز دھارے میں بہہ گئے۔ اب کی وہ بادل نہیں جو بغیر برسیں نکل جائیں۔ وہ بڑبڑایا۔۔۔

اور گھڑی کی سوئیاں دیکھنے لگا۔ صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۷۲ء

کھنڈر

ہوا خاموش تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ چاندنی، پھیکی چاندنی، بیمار چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں دن سے ہی بند ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ رات نے اپنی کالی چادر تان دی تھی۔ وہ بار بار یہی سوچتا تھا کہ آخر اس نے ایسا کون سا جرم کیا تھا کہ اس نے ملنے سے انکار کردیا تھا۔ اس کی خودداری کو چوٹ لگی تھی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ سشما اس سے اس حد تک ناراض ہوسکتی ہے۔ اس نے ایسی کوئی بات تو نہیں کہی تھی۔ صرف اتنا ہی تو کہا تھا کہ ''میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے بہت زیادہ چاہنے لگا ہوں۔ تمہیں پا کر اپنا تمام درد وغم بھول چکا ہوں۔ تمہارے خلوص نے دل میں پیار کی شمع روشن کردی ہے۔ تمہارے اسی پُرخلوص جوش ویقین نے میرے دل میں اعتماد ویقین کی شمع روشن کردی ہے۔ ایک نیا جوش اور پر اعتماد جذبہ نے نئی طاقت اور نئی توانائی بخش دی ہے اور زندہ رہنے کی اور کچھ کرگزرنے کی خواہش دوچند کردی ہے۔ بولو تم کیا کہتی ہو۔''

میرے دل میں شک وشبہ کا سایہ پڑنے لگا تھا اور تم خاموش اور پھر تمام راستے خاموشی ایسی خموشی کسی نہ کسی معنی کے ساتھ ضرور ہوتی ہے۔ تمام جسم میں خوف واندیشہ کا سایہ رینگتا چلا گیا تھا۔ تم نے میرے کسی جذبہ کا احترام کیے بغیر یا جواب دیے بغیر واپس لوٹ گئی تھیں اور آج یہ کہلایا کہ ''سشما نہیں

ہے وہ مرچکی ہے اس سے اب ملنے کی کیا ضرورت۔"

اب میں تمہیں کیا بتاؤں اس وقت میری کیا حالت تھی۔ مجھ پر کیا گزری اور کس طرح میں اپنے کمرے تک پہنچا ہوں۔ کچھ یاد نہیں، کچھ ہوش نہیں۔ گزشتہ دنوں کے سائے مجھے چھوتے جاتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ آنکھوں میں جلن ہے۔ مجھے تمہارے اس برتاؤ سے بہت دکھ پہنچا ہے۔ میں نے تم سے پیار کی بھیک نہیں مانگی تھی۔ تم خود پکے پھل کی طرح میری گود میں آگری تھیں۔ میرے لیے تو دو قدم بھی بڑھنا مشکل تھا۔ تم نے ہی مجھے آگے بڑھنے کے لیے اُکسایا تھا۔ یہ تمہاری اپنائیت تھی۔ تمہیں نے میرے دل میں شمعِ امید روشن کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم صرف میری ہو اور ہمیشہ میری رہو گی۔

بولو — یہ خاموشی کیسی۔ بتاؤ خطا کار میں یا تم یا میری قسمت — لیکن تم مجرم کیوں، مجرم تو میں، جس نے تمہارے اس جادوئی تبسم پر بھروسہ کر لیا تھا۔

یاد کرو — وہ دن — وہ وقت — وہ لمحہ۔ جب تم نیلی ساڑی میں پربھاؔ، مالتیؔ، صبیحہؔ اور ناہیدؔ کے ساتھ پارک کے ایک الگ گوشہ میں آہستہ آہستہ ٹہل رہی تھیں۔ خوش قدمی کے دیے جلا رہی تھیں اور میں قریب ہی کوئن وکٹوریہ کے مجسمہ سے پندرہ گز دور ایک سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھا سفید خرگوش کے جسم پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ تم نے مجھے دیکھا اور اپنی سہیلیوں سے کیا کچھ کہا، پھر سب کی نگاہیں میری طرف ایک ساتھ اُٹھ گئیں تھیں اور تمہاری وہ مند مسکان مجھے بھی چونکا گئی تھی لیکن میں دوبارہ خرگوش کی شرارتوں میں کھو گیا تھا۔ جس نے اپنے ننھے ننھے پیر میرے کندھے پر رکھ دیے تھے۔

اور پھر تم جب دوسری بار اسی راستے سے گزری تھیں تو اکیلی تھیں۔ پربھاؔ اور ناہیدؔ ایک موم پھلی والے کے پاس رک گئی تھیں۔ صبیحہ جھولے پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ مالتی پھولوں پر منڈلاتی ہوئی تتلیوں کو پکڑنے میں خود تتلی بن گئی تھی۔ تم نے مجھے کئی بار دیکھا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کی چوری بھی پکڑی تھی۔

میں ہر روز اپنے ننھے خرگوش کے ساتھ آتا اور یہیں اسی بینچ پر بیٹھ کر تمہاری مسکراتی آنکھوں کو، گنگناتے ہونٹوں اور رقص کرتی پلکوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ دل میں امیدوں کی حسین پریاں رقص کرتیں، مجھے محویت کے حصار میں مقید رکھتیں۔

میں نے کئی بار سوچا تم کو روک کر تمہارا نام ہی پوچھوں اور یہ بھی پوچھوں کہ آخر کیوں میری زندگی میں طوفان لانا چاہتی ہو لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ رفتہ رفتہ تم میری زندگی کے قریب آتی جا رہی تھیں اور

دل میں امیدوں کے ننھے ننھے چراغ لو دینے لگے تھے۔ منہ بند کلیاں پھوٹنے لگی تھیں۔ میں نے کئی بار دور افتادہ چلمنوں سے اس کھنڈر کو دیکھا تھا جہاں ماضی کا وہ مجسمہ نصب تھا جو وقت کا زائچہ لیے موجود تھا لیکن اس کے باوجود تمہاری طرف سے پیٹھ نہیں موڑ سکا۔ اور نہ تم کو آگے بڑھنے سے روک سکا۔

تم ہر روز ایک نئے رنگ میں نظر آتیں۔ ایک دن جب سورج غروب ہونے کو تھا، شعاعیں اپنا رخ موڑ چکی تھیں اور باقی ماندہ سنہری دھوپ رنگین پھولوں کو اور درختوں کے سبز پتوں کو الوداعی بوسہ دے رہی تھیں۔ ہواؤں میں خوشبوئے گل گھلنے لگی تھی، تم رانی وکٹوریہ کے مجسمہ کے قریب سرخ ساڑی میں ایک سیڑھی پر تنہا بیٹھی ہوئی تھیں۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل رقص کر رہے تھے اور تم بیر بہوٹی کی طرح محو ہو رہی تھیں۔ تمہارے جسم پر قوسِ قزح کی دھوپ پھیلی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں آشنا نہ مئے سے بنی کمان کھینچی ہوئی تھیں۔ تمہارا داہنا ہاتھ تمہارے داہنے رخسار پر تھا اور نہ جانے تم کس خیال میں ڈوبی ہوئی اپنے آپ سے بے خبر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ تمہارا آنچل سرک کر تمہاری گود میں آ گرا تھا۔ نسوں میں ایک بجلی تھی جو سر سے پیر تک چمک رہی تھی۔ مجھ میں اس شراب آسا منظر کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ ایک نشہ تھا جو بدن کے رگ رگ میں دخیل ہو گیا تھا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسی وقت تمہاری نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں تھیں جیسے مئے بھرے ساغر ٹکرا گئے ہوں۔ مئے چھلکی ہو اور پھر تم گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھیں جیسے کسی خواب نے جگا دیا ہو۔ چونک اٹھی ہو۔

شرگیں آنکھیں اور جھک گئی تھیں اور جھکی پلکوں نے پردہ کرنے کی کوشش کی تھی اور پیشانی پسینہ پسینہ ہو گئی تھی۔ اوس کی بوندھیں چمک اٹھی تھیں۔ ہونٹ کے کنارے سرخ ہو گئے تھے۔ جانے تمہاری آنکھوں میں کیا جادو تھا کہ میں تمہاری جانب کھنچتا چلا گیا تھا۔ وقت روبرو تھا اور کل کہیں دور جا چکا تھا۔ ماضی کا کوئی سایہ بھی دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔

تم جب واپس لوٹ رہی تھیں تو میں یہی محسوس کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور میری نظریں تمہاری رفتار کی نازکی کا بوسہ لے رہی تھیں۔ تم اتنی زیادہ خاموش اور محتاط کہ یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ اس خاموشی کا کیا راز ہے اور کس بات کو تم چھپانا چاہتی ہو۔ تمہاری اس خاموشی نے میرے جسم کے ہر حصے میں شبہات کے کانٹے بچھا دیے تھے اور آنکھوں سے نیند روٹھنے لگی تھی۔ رات سنسان، دن درد آمیز اور یہ احساس کب شام ہو اور کب تم سے ملنے کی آرزو پوری ہو۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں تمہیں روک کر اپنا دل کسی کتاب کی طرح کھول کر رکھ دیتا مگر یہ سوچ کر کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ اور پھر تمہارے

دید سے ہی نہ محروم ہو جاؤں۔

بولو یاد ہے ــــ وہ دن جب کئی دنوں کے بعد میں پہنچا تھا تو تم اسی بینچ پر بیٹھی تھیں۔ تمہارے بدن پر کریم کلر کی ساڑی تھی۔ ہونٹوں پر تھکن کے نشان، آنکھوں میں انتظار کی دھوپ، چہرہ پر سورج کی لکیریں، مجھے دیکھتے ہی تم سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ کان کی دونوں لویں گرم ہو کر جلنے لگی تھیں۔ قدموں میں لغزشیں ایسی لغزش کہ اب گرا تب گرا۔ آنکھوں میں نمی، خوشی کے آنسو، غیر موجودگی کا انعام۔ شاید تم کو کئی دنوں کے بعد دیکھا تھا اور تمہیں دیکھ کر محسوس ہوا تھا کہ جیسے تمہیں بھی میرا انتظار تھا۔ ایک ایسا انتظار جو خوبصورت آنکھوں میں آنسو، نرم چہرے پر دھوپ اور لبوں پر پپڑیاں جما دیتا ہے۔

تم نے مجھے دیکھا تھا اور میں نے اپنی ساری ہمت سمیٹ کر یہی کہا تھا بیٹھیے، میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔

تم نے کہا تھا ــــ نہیں

اور پھر تم نے ہی بات بڑھائی تھی۔ ایک سانس میں کتنے سوال پوچھ بیٹھی تھیں۔ ان سوالوں میں احساس کی خوشبو، اپنائیت کی آنچ دہک رہی تھی اور تمہاری بات چیت میں ایسی نرمی اور حلاوت تھی کہ آزردگی کی وہ سب تمام کیفیتیں خود میں تحلیل ہو کر ماند پڑ گئی تھیں اور میں اپنے آپ کو بہت خوش تقدیر سمجھ رہا تھا۔ تمہاری اس اپنائیت میں ایک ایسا نشہ تھا کہ وقت کب گزرا، پتہ ہی نہ چلا۔ وہ تو اس وقت جب آفتاب کی کرنیں واپس لوٹ رہی تھیں تو خواب سے چونکا تھا۔ مدت کی دبی آرزوؤں نے وہ طول کھینچا تھا تو یہ ہوش بھی نہیں رہا تھا کہ یہ پہلی ملاقات ہے اور ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔

اس پہلی ملاقات نے کچھ ایسے نشان چھوڑے تھے کہ جن میں امید و یقین کی سبک لہریں تھیں، شعریت تھی اور اب میں ہر ملاقات کے بعد تم سے اور بھی زیادہ قربت محسوس کرنے لگا تھا اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے ہمیں اور بھی زیادہ قربت آشنا کر دیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن اور درمیانی وقفہ یک رنگی کا ثبوت بن گئے ہیں یا میں خود کو کسی باد و باراں میں گھرا محسوس کر رہا ہوں۔ تمہارا چہرہ کبھی سامنے تو کبھی بادلوں میں گھرا دیکھتا ہوں اور میں کسی زخمی پرندہ کی طرح اونچائی سے نیچے گرتا ہوا محسوس کر رہا ہوں اور آسمان سے سرخ سرخ بوندیں ٹپک رہی ہیں۔

ایک ایسا دھواں چاروں طرف بڑھتا جا رہا ہے جس میں یادیں سسک سسک کر دم ہی نہیں توڑ

رہی ہیں کالی بھی پڑتی جارہی ہیں۔

آنکھوں میں جلن اور اس کے پیچھے بہت دور ایک بہت خوبصورت چہرہ—— تمہارا چہرہ جسے میں نے اپنے دونوں ہتھیلیوں کی رحل پر رکھ کر اپنے ہونٹوں کی اور آنکھوں کی پیاس بجھائی تھی۔ تمہارے سیاہ گیسو جب میرے چہرے پر بکھر جاتے تھے تو میری لرزیدہ انگلیاں انہیں سنوار دیا کرتی تھیں اور تمہارے چہرے پر شرم وحیا کی دھوپ پھیل جاتی تھی۔ تمہارے خوبصورت اور سرخ ہونٹوں کی شراب چرانے کے باوجود تشنگی کم نہیں ہوتی تھی۔ تمہارے سینے کا اتار چڑھاؤ دل کے الجھے تاروں میں ایسا الجھتا تھا کہ آرزوؤں کے مسکراتے پھولوں سے میرا دامن بھر جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا لمحہ آتا کہ میں تمہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر ایک نقطۂ مخصوص بن جایا کرتا تھا اور یہ بھی نہ معلوم ہو پاتا تھا کہ میں کون تم کون؟ میں اور تم کا فرق مٹ گیا تھا۔ صرف ہم اور خوشیوں کا پالنا، خوشبوؤں کی پھوار، نغموں کی چہکار ایک ایسی وادی میں پہنچا دیتی جہاں تمہارے ہونٹ، تمہارے رخسار اور تمہارا گنگناتا بدن، قوسِ قزح بن جاتا۔ اور میں اس میں گم ہو کر یہ تک بھول جاتا کہ رات کیسی ہوتی ہے، دن کیسا ہوتا ہے۔

بولو سشما میری کیا غلطی تھی، میرا کیا گناہ تھا میں اس حدِ معینہ سے تو آگے نہیں بڑھا۔ ادب وتمیز کا پاس ولحاظ رکھا۔ تم کو ہوس پرست کہنے کا موقعہ نہیں دیا۔

میری اچھی سشما تمہاری یہ خاموشی میرے وجود کو بکھیر کر رکھ دے گی اور میں خشک پتہ کی طرح دھول کے لباس میں بہہ جاؤں گا اور یہ قصر یقیناً کھنڈر بن کر رہ جائے گا۔

——————۱۹۶۸ء

لمحات یقین کے

اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا تم کو کل آنا تھا آج کیوں آ گئے۔ وقت کا، اصول کا پاس ولحاظ رکھو۔ میں نہ ملتا تو تم کیا کرتے۔ کتنی دور سے آنا۔ تکلیف الگ، خرچ الگ۔ اب اگر تم کو آج ادھر کسی سے ملنا تھا، کوئی کام تھا تو مجھ کو فون سے خبر تو کر دیتے یہ کیا۔ بہر حال آؤ۔ جو کام تم کو کرنا تھا وہ کام تم نے پورا کیا یا نہیں۔

میں جانتا ہوں تم ان دنوں سخت پریشانی میں مبتلا ہو۔ تمہیں تمہارے بھائیوں نے بہت تکلیف دی ہے، نہ صرف تکلیف بلکہ مالی دقتوں سے بھی تمہیں دو چار کر دیا ہے۔ کیا تم وہیں والدین کے گھر میں رہتے ہو یا مکان ہی تبدیل کر دیا ہے۔ ہاں بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔

میں یہیں اپنے اسکول میں تو تم کو کوئی جگہ فی الحال نہیں دلا سکتا مگر قریب ہی محلہ حسن پور میں نعیم الدین صاحب ایک کوچنگ سنٹر چلاتے ہیں، ان سے کہوں گا انہیں ایک ایسے ٹیچر کی ضرورت ہے جو میتھ کے طلبا کو اچھی طرح ڈیل کر سکے اور یوں بھی تم اس میں بڑی مہارت رکھتے ہو۔ ہاں یہ لو میں ابھی تمہاری بات کرائے دیتا ہوں اور جاؤ مل کر جو فیصلہ ہو اس سے مجھے خبر کر دینا یا موقعہ ملے تو ملتے چلے جانا کیونکہ تمہارے گھر کا راستہ اسی کلدیپ چوراہے سے ہو کر ہی گزرتا ہے۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کی اہلیہ کتنی پریشانی میں ہوگی۔ میرے دوست کی بہن اس وقت اور پریشانی میں، میں الماسؔ کے لیے ضرور کوشش کروں گا کہ اسے تدریس کا یہ موقع ضرور مل جائے۔ تاکہ وہ اپنے بچوں کی ضرورتیں پوری کرسکے اور گھر کو منظم رکھ سکے۔ بھائیوں کے غلط برتاوے نے اُسے کئی سارے مسئلوں سے دوچار کردیا ہے۔

میں ابھی باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ اہلیہ نے مجیب کو ڈاکٹر نظیر کے یہاں لے جاکر دکھلانے کو کہا۔

مجیبؔ ان دنوں سر کے درد سے پریشان ہے۔ وقفہ وقفہ سے بخار آجاتا ہے اور سر میں درد سا جاتا ہے — ڈاکٹر کہتے ہیں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہوجائے گا۔ اور اہلیہ ہیں کہ اس کی طرف زیادہ دھیان نہ دے کر اپنی امی کی بیماری کا رونا روتی رہتی ہیں۔

عجیب مسئلے ہیں جس نے مجھے ایسا گھیر رکھا ہے کہ اپنا کام میں نہیں کرپاتا۔ گاؤں کے پردھان نریندرؔ سے بھی ملنا ضروری ہے۔ اینٹ بھٹے کا کام بھی دیکھنا ہے، کل وہیں جانا ہے۔

ابھی تھکا ماندہ گھر لوٹا ہوں۔ اہلیہ فرمائش کے ساتھ یہ کہہ رہی ہیں کہ کل میں امی کے یہاں جاؤں گی۔ شام تک واپس لوٹ آؤں گی۔ ڈرائیور کلدیپ سے کہہ دیجیے گا کہ سویرے ہی آجائے، مجھ کو چھوڑ آئے اور شام ۶ بجے تک واپس لے آئے۔

ٹھیک ہے۔ مگر تم کو پنچایتی کاموں کی نگرانی بھی کرنی ہے۔ تم عورتوں کے مسئلے بھی حل ہونے ہیں۔ زچہ بچہ اسپتال کے کھولنے کے لیے یوپی حکومت تیار ہوگئی ہے۔ وہ ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہے۔ اس صورت میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔

اہلیہ سماجی کاموں میں بہت آگے ہیں اس لیے گاؤں میں ان کی عزت اور توقیر بھی۔ میں تنہا تھا ور بھٹے پر جانا تھا۔ وہ بھٹہ جس نے مجھے جینے کا سلیقہ بتلایا۔ آدمی کی مکمل شبیہ تبھی بنتی ہے جب وہ وقت کے تمام نشیب و فراز، تکلیف و اذیت، سلگتے، چٹختے انگاروں کے درمیان خود کو گزار لینے کا حوصلہ رکھے۔ یہی وہ حوصلہ ہے جس نے مجھے سرخروئی دی، جسے میں لمحاتِ یقین سے نسبت دے سکتا ہوں۔

——————۱۹۶۸ء

گلابی تتلی

کون؟

اچھا اچھا آپ ہیں۔

بھائی کیسے سب خیریت ہے نہ، بہت دنوں بعد تمہیں اس طرح ہنستا مسکراتا دیکھ رہا ہوں۔ کہاں تھے؟ اب کیا مشغلے ہیں۔ وہ تمہاری رکمنی کہاں؟ اس کو یہاں کسی بھی شاعری یا سنگیت کی محفل میں نہیں دیکھا۔ میں ہی نہیں میرے دوست بھی فکرمند رہے ہیں۔ دراصل سنگیت کی محفلوں میں تم ہی نہیں وہ بھی ہمیشہ آگے آگے رہتی تھیں۔ میں نے خود پریاگ کلا کیندر کے لیے پروگرام کیے۔ رکمنی ہوتی تو میں بہ سہولت رقص کی محفل بھی آراستہ کرلیتا۔

اچھا خیر۔ یہ بتاؤ کیا حال چال ہیں۔ متی دیو سنگھ کے ہاں کیا ادھر تمہارا آنا جانا نہیں ہوا۔ ان سے بھی بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ بہت پری پکیہ طبلہ وادک ہیں۔ ان کی انگلیوں کو رقص کرتے دیکھ کر بھائی لال جی سریواستو کی یاد آتی ہے۔ وہ ہمیشہ ہر پروگرام میں اپنی نائیکہ ودھا کے ساتھ محفل کو سرتال میں ایسا باندھ دیتے کہ رقص کرتی انگلیاں پریاں بن جاتیں۔ افسوس ان کی وفات سے سرسنگیت کی محفل ہی نہیں سونی ہوئی بلکہ پریاگ کی دھرتی پر گنگناتی انگلیوں میں وہ رقص و سرود کی

خوشبو باقی نہیں رہی۔

ہاں تم کو تو معلوم ہے کہ ان کے بیٹے پون کشور اپنے پتاجی کی یاد رکھتے ہوئے شری لال جی سنگیت مہاودیالیہ سیدھی (ایم پی) آچاریہ لال جی سنگیت مہاودیالیہ دھام پور (یوپی) آچاریہ لال جی سنگیت مہاودیالیہ شاہجہانپور (یوپی) کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔

ارے بات کہاں کی کہاں پہنچی۔ میں نے تمہارا حال اس طرح پوچھا ہی نہیں جیسا کہ پوچھنا چاہیے تھا۔ اب بتاؤ پتاجی وغیرہ سب ٹھیک ہیں؟

ادھر ملک کے حالات میں بہت ابتری آئی ہے۔ ملک کا نظم و نسق بھی درہم برہم ہے۔ مہنگائی اپنی چرم سیما کو پہنچ رہی ہے اور تم اپنی اس ملازمت میں کیسے کس طرح زندگی کو آئینہ دکھا سکنے کا حوصلہ کر سکتے ہو۔ تم جانتے ہو آج رشتوں کی توڑ پھوڑ میں بھی بیجا کمائی بڑھتی جاتی ہے اور پانی سر سے اوپر تک پہنچ چکا ہے۔ قریبی رشتوں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ تمہارے چاچا کا ان دنوں تمہارے ساتھ کیسا برتاوا ہے۔ سنا ہے اس بار وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے ایم ایل اے کا الیکشن لڑنا چاہتے ہیں۔

اچھا تو لو یہ ناشتہ کرو۔ میں تم کو کچھ ایسی غزلیں سناتا ہوں، تم اپنے سُر تال میں ان کو زندگی سے اور بھی زیادہ قریب کر دو گے۔ ہاں یہ میرا نیا شعری مجموعہ ہے "سرِشام" اس میں وہ بہت ساری غزلیں ہیں جن کو مشاعرہ کے اسٹیج پر تم دیکھ چکے ہو سن چکے ہو۔۔۔

تم نے کسی کو پوچھا۔ تلک راج کو وہ تو پچھلے سال ڈبل نمونیہ کے باعث وفات پا گئے ہیں۔ وہ ہم سب کے بہت اچھے دوستوں میں تھے۔ کیا جانے کا ارادہ ہے جو بار بار پہلو بدلتے ہو اور کچھ کہنا چاہتے ہو رک جاتے ہو۔ بولو کیا بات ہے۔

بھائی معاف کریے گا۔ سب کچھ اچانک ہوا، میں اپنے دوستوں کو بھی نہیں بلا سکا اور بہت خاموشی سے عجلت میں والد صاحب کی فرمائش پر وِواہ کر لیا۔ اب آپ چونکیں گے، کس سے، کب، اور کیسے۔ تو دیکھیے۔ یہ سامنے آپ کے ــــ رکمنی ــــ وہی رکمنی، میری رکمنی ــــ

واہ بہت خوب۔ مبارک رہو ــــ تم کو تمہاری رکمنی مل گئی۔ اب اس سے بڑھ کر کیا۔ آج کئی سالوں کے بعد تم کو دیکھا، رکمنی کو دیکھا ــــ

اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے سنگیت کے سروں کو ایک من موہنی پرتھما مل گئی ہے۔

لو وہ دیکھو تمہاری بھابی بھی آ گئی ہیں۔ بہن کو دیکھنے گئی تھیں۔ وہ کئی ماہ سے بیمار ہے۔ اسے

استھما کی شکایت ہوگئی ہے اور شوہر ہے کہ اپنی معمولی سی تنخواہ کے باوجود گھر کی خوشی کے لیے ہر تگ و دو میں معروف رہتا ہے۔ ان کی محبتیں گاؤں کے لیے اک مثال بن گئی ہیں۔

اور ہاں ہم نے تم دونوں کی خوشی کی خاطر کل "نرمل سنگیت گرہ" میں ایک محفل آراستہ کرنے کا فیصلہ ہے۔ کرم دیو جی کو خبر کردی ہے۔ دیکھو تمہاری بھابھی تم دونوں سے کیا کہنا چاہ رہی ہیں، سن لو پھر دیکھو یہ گلاب کیا کہہ رہا ہے۔ اس کی پنکھڑیاں کیا کہہ رہی ہیں۔ تتلی کو دیکھو، اس گلابی تتلی کو دیکھو، رقص کر رہی ہے گلاب کے ساتھ — رنگنی کے ساتھ —

——————— ۱۹۸۴ء

یہ کیا؟

ماسٹر اعجاز ہاتھ میں رجسٹر لیے ہوئے کلاس میں داخل ہوئے — ان کے پیچھے کلاس مانیٹر تھا جسے لڑکے ''کالی مائی'' کہہ کر چڑھاتے تھے۔ اسے دیکھتے ہی لڑکوں کے چہرے پر میر انیس کے مرثیے مجسم ہوگئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے کان میں بظاہر نہایت خاموشی سے کہا — ''آفت آئی'' — لیکن آواز کوئی پردہ نشین تو ہے نہیں کہ محرم نامحرم کا فرق برقرار رکھے۔ ماسٹر صاحب نے اپنے ہونٹ اس طرح بنائے جیسے گال سے مکھی اڑانا چاہتے ہوں۔ انہوں نے گرج کر کہا — لڑکو! ریاضی کی کاپی جمع کرو۔

کلاس مانیٹر نے اپنی ریاضی کی کاپی حاضر کردی اور کلاس کے دیگر لڑکوں کی طرف فاتحانہ نظر ڈالی۔ تمام لڑکوں کا دل آندھی میں لگے ہوئے جھنڈے کی طرح تھرتھرایا۔ ماسٹر اعجاز نے دیگر تمام لڑکوں سے کاپی نہ لانے کا سبب پوچھا اور ان کے ساتھ اس طرح پیش آئے جیسے کوئی بھکاری بچہ سوکھی روٹی کو اس طرح کھاتا ہو جیسے اس کا پکا دشمن ہو — بعد ازیں کسی ضروری کام سے باہر چلے گئے تو رمیش جس نے کل ہی داخلہ لیا تھا اور کلاس میں سب سے صحتمند اور قبول صورت تھا، اس نے کہا — ''کالی مائی آئی نہیں کہ آفت آئی۔ ہم سمجھے تھے آج کالی مائی نہیں آئے گی'' —

سٹ اپ — آنے دو ماسٹر صاحب کو تو تمہاری مرمت اچھی طرح کروادوں بدتمیز — تم نے

اپنے کو سمجھ کیا رکھا ہے—

رمیش نے اسے اپنے قریب نہایت خلوص سے بلا کر کئی دھول جما دیے اور منھ چڑھا دیا۔ سارا کلاس قہقہوں سے بھر گیا۔ کلاس مانیٹر لڑکھڑایا اور رمیش کا ہاتھ پکڑ لیا— مجھے کیوں مارا— مجھے کیوں مارا— کہہ کر رونے لگا۔ آناً فاناً دوسرے کلاسز کے لڑکے جمع ہو گئے خاصہ مجمع لگ گیا جیسے لڑکے زمین کے اندر سے نکل پڑے ہوں۔

ماسٹر اعجاز جو نہایت فراخ دلی سے چپراسی سے خوش گپی میں محو تھے اور چار مینار دھونک رہے تھے، خطرے کی بو سونگھ کر کلاس میں داخل ہوئے۔ مانیٹر مجمع کو اپنی خون بھری انگلی کو دکھا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے سیاہ فام چہرے پر لکھا تھا— میں اس کا مزہ چکھاؤں گا حرام زادے— اور انگلی خود فتح کا پرچم نظر آ رہی تھی۔

— یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ اپنی انگلی کیوں اٹھائے ہو؟ کون چلایا تھا؟

ماسٹر صاحب— میں آپ کے جانے کے بعد نہایت شرافت سے بیٹھا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے قریب بلا کر کئی دھول رسید کر دیے اور انگلی کو فوئین ٹن پن سے زخمی کر دیا۔ ایک ہفتہ تک تو شاید اس انگلی سے کام ہی نہ لے سکوں گا—

ہوں— خیر— ماسٹر اعجاز نے کھانستے، بھنوئیں سکیڑتے ہوئے سختی سے کہا۔

کیا نام ہے کمبخت— ابھی کل ہی داخلہ لیا— آج ہی پر نکل آئے۔ میں اس کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں کر سکتا۔ خاصہ کمینہ نظر آتا ہے۔ ابھی پنکائی ہوئی ابھی ہی شرارت— نکالو کاغذ تو میں پرنسپل صاحب سے اس کی رپورٹ کرتا ہوں— ایسا جرمانہ ہوگا بدمعاش پر کہ بس— ساری شیخی گھر پر ہی دھری رہ جائے گی۔ ابھی مزہ چکھاتا ہوں آخر سمجھا کیا ہے— کلاس مانیٹر کی طرف مڑتے ہوئے کہا— نکال تو کاغذ ہرنام— پھر رمیش سے مخاطب ہوئے— ”تیرے باپ کا کیا نام ہے— کہاں رہتا ہے؟“

رمیش بدستور خاموش رہا۔ ماسٹر صاحب نے کئی بار استفسار کیا تو کلاس مانیٹر نے کہا— ”سر! اجے کمار ایم پی کا لڑکا ہے جو کالج کے سکریٹری ہیں۔“

”اجے کمار سکریٹری صاحب— ہوں! ہرنام ذرا میرا کوٹ اتار— اُف کیا گرمی ہے، بارش ہونے ہی والی ہے“— پھر ہرنام سے مخاطب ہوئے— ”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہیں اس نے مارا کیسے! معلوم ہوتا ہے اسے لڑکوں نے اُکسایا ہے تبھی اس سے اتنی گندی حرکت سرزد ہوئی“— پھر رمیش

سے کہا۔ ’’رمیش بیٹھ جاؤ— اب شرارت کبھی نہ کرنا۔ اچھے بچے ایسے کام نہیں کرتے— میں سمجھ گیا کہ تم ڈر کے مارے آج ریاضی کی کاپی بھی نہیں لائے کہ سوالات غلط ہوں گے تو ماسٹر ہم کو پیٹیں گے۔ تم رف کاپی لایا کرو خواہ تمام حل غلط ہی کیوں نہ ہو— میں تم کو سمجھاؤں گا— فرصت کے اوقات تم مجھ سے سوالات پوچھ لیا کرو— اچھا— میں بخوشی تمہیں بتاؤں گا— آج کل تمہارے پتا جی کہاں ہیں؟‘‘

’’میرے پتا جی اپنی دکان پر ہیں‘‘— اس کے چہرے پر چونکا دینے والی چاندنی کا نکھار تھا۔

’’پتا جی نے کوئی دُکان بھی شہر میں کھول لی ہے کیا؟ دُکان کافی شاندار ہوگی۔ وہ کب دہلی سے آئے— میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں— کس وقت اُن سے ملاقات ہوسکتی ہے؟ تم بہت اچھے ہو شاباش!‘‘—

’’اجے کمار جی میرے پتا نہیں ہیں— میرے پتا جی کا نام پرکاش ہے۔‘‘

’’اچھا! ان کے بھتیجے ہوگے— ان سے کہنا ہمارے ماسٹر اعجاز بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔‘‘

’’جی نہیں، میں ان کا کوئی نہیں ہوں— ان کے بغل میں رہتا ہوں۔ ان کے لڑکے سے مجھ سے دوستی ہے اس لیے انہی کے گھر پر زیادہ تر رہتا ہوں— اس لیے ہر نام نے سمجھا میں ان کا لڑکا ہوں۔‘‘

’’ہوں! کل تمام سوالات صحیح ہوں— ورنہ کھال ادھیڑ لوں گا مکار— دماغ میں بھوسہ بھرا ہوا ہے نالائق کے‘‘— تمام لڑکے بھونچکے رہ گئے۔

———— ۱۹۶۴ء

نام : ساحل احمد

وطن : ہندی ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

پیدائش : ۲۱؍اپریل ۱۹۳۸ء

تعلیم : الہ آباد اور علی گڑھ۔

مشغلہ : درس وتدریس (۱۹۶۴ء سے ۲۰۰۰ تک)

آخری ملازمت : یوئنگ کرسچین آٹونامس کالج، الہ آباد یونیورسٹی

ریٹائرڈ : جون ۲۰۰۰ء (بہ حیثیت صدر شعبۂ اردو اور ریڈر)

رابطہ : فنکس اپارٹمنٹ، ۲۶۲ نور نگر ایکسٹینشن، دوسری گلی، گراؤنڈ فلور

جوہری فارم، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

ٹیلیفون : 09818075848